احوال و آثار اقبال

— چند پہلو

(جلد دوم)

○

ڈاکٹر
محمد باقر

○

بزمِ اقبال ○ کلب روڈ ○ لاہور

احوال و آثار اقبال

— چند پہلو

(جلد دوم)

○

ڈاکٹر
محمد باقر

○

بزمِ اقبال ۔ لاہور

جملہ حقوق محفوظ

طبع اول : نومبر ۱۹۸۸ء

تعداد : ۵۰۰

O

ناشر : ڈاکٹر وحید قریشی
اعزازی معتمد بزم اقبال ، ۲ - کلب روڈ - لاہور

مطبع : ظفر سنز پرنٹرز
۹ بی ، کوپر روڈ ، لاہور

طابع : سید ظفر الحسن رضوی

صفحات : ۷۲

قیمت : ۲۵ روپے

O

فہرست

عنوان	صفحہ
۱ ۔ اقبال اور تصوف	۱
۲ ۔ اقبال اور دین	۱۳
۳ ۔ کتابیات	۲۷
۴ ۔ اقبال کی ہنگامی شاعری	۲۹
۵ ۔ اقبال اور معاشرہ	۳۱

6. Shaikh Muhammad Iqbal
A McLeod Punjab Arabic Reader at University Oriental College, Lahore 1

7. Iqbal Concept of an Ideal Society 13

اقبال اور تصوف

کسی عام فرد کے امیال و عواطف اور اس کے فکری رجحانات کا احاطہ کرنا آسان نہیں لیکن نابغہ کے تمایلات کے متعلق کوئی حکم لگانا اور بھی مشکل ہے ۔ خصوصاً اس صورت حالات میں جب کہ اس کی ذہنی اثر پذیری کا امتداد طویل ہو اور اس کے روابط اور زندگی کے تجارب متعدد ممالک ، اشخاص اور تحریکات پر محتوی ہوں ۔ بیسویں صدی میں علامہ اقبال کی تقریباً نصف صدی (۱۹۳۸ ۔ ۱۸۹۳ء) کی عمر کا دور کچھ ایسے حالات میں بسر ہوا ، جس کی تفصیل کا جائزہ لینا آج کے موضوع سے خارج ہے ، لیکن ایک بات یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ اقبال ان پینتالیس سالوں میں نہ صرف نابغہ روزگار کے طور پر ابھرا بلکہ اس صدی کا عظیم ترین نظریاتی مفکر ثابت ہوا ۔ افسوس ہے کہ اقبال کا مکمل مطالعہ اس زاویہ نگاہ سے نہیں کیا گیا کہ وہ کائنات میں انسان کی اقبال مندی کا کس قدر خواہاں تھا اور اپنے افکار کا اور اس نے کس مشاہدے اور مطالعہ سے پوری دیانت سے منتخب کیا ۔ اس سلسلے میں بعض ایسے مفروضات قائم کیے گئے جن کا نہ کوئی وجود تھا اور نہ شواہد ۔ مثلاً یہ کہا گیا کہ اقبال متصفوین کی ردیف اول کا آدمی تھا اور اپنی سوچ میں حسین منصور حلاج سے بے حد متاثر تھا[1] ۔ یہ بھی کہا گیا کہ ۱۹۱۶ء تک وہ تصوف اور حسین کا شیدائی تھا لیکن اس کے بعد اس کی سوچ بدل گئی ۔

> ".....they (the undercurrents in his thought) prove also how deeply embedded the roots of his feeling and thinking were—Consciously or unconciously—in the great mystical tradition of his country." (Schimmel, 341).

---

1. Schimmel, Annemarie, Gabriel's Wing, 314, 342 and 346

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اقبال صوفیاء کے قادریہ فرقے سے وابستہ تھا :

"Abdulqadir Gilani, the great Iraqian mystic (d. 1166) and founder of the Qadiriya order to which Iqbal was affiliated, explains the ana'l haqq in the following way." (Schimmel, 347 & 372).

علامہ اقبال کا عقیدہ کیا تھا ۔ اس کے متعلق ایک پختہ اور واضح بیان سن لیجیے جو انھوں نے اپنی وصیت میں درج کیا ہے : آپ فرماتے ہیں :

"میں عقائد دینی میں سلف کا پیرو ہوں ۔ نظری اعتبار سے فقہی معاملوں میں غیر مقلد ہوں ۔ عملی اعتبار سے حضرت امام ابو حنیفہ کا مقلد ہوں ۔"[1]

۱۹۱۰ء کی علامہ کی ایک تحریر پر انحصار کر کے یہ ادعا کیا گیا ہے کہ وہ قادریہ فرقے کے پیرو تھے ۔ یہ ایک خط ہے جو انھوں نے سید سلیمان ندوی کو لکھا ؛ وہ فرماتے ہیں :

"خواجہ نقشبند اور مجدد سرہند کی میرے دل میں بڑی عزت ہے مگر افسوس ہے کہ آج یہ سلسلہ بھی عجمیت کے رنگ میں رنگ گیا ہے ۔ یہی حال سلسلہ قادریہ کا ہے جس میں میں خود بیعت رکھتا ہوں ۔"[2]

لیکن اس خط میں انھوں نے یہ بھی لکھا ہے :

"اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ تصوف کا وجود ہی سر زمین اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے ۔"[3]

رہی یہ بات کہ وہ بزرگان دین ، آئمہ کرام اور مشائخ کے مدح خواں تھے تو یہ کوئی انہونی واردات قلب نہیں ہیں ۔ ہر وہ شخص جسے اسلام سے محبت ہے وہ ان خدام دین سے عقیدت کا اظہار کرتا ہے

---

۱ ۔ روزگار فقیر ۔ فقیر سید وحیدالدین ، ص ۵۹ ۔
۲ ۔ اقبال نامہ ۔ مرتبہ : شیخ عطاءاللہ ، جلد اول ، ص ۵۹ ۔
۳ ۔ ایضاً ، ص ۷۸ ۔

جنھوں نے برجستہ خدمات سر انجام دی ہیں اور علامہ بھی انہی ذی شعور خواص میں سے تھے۔ اسی لیے اُنھوں نے اخلاق ِ مذہب کے متعلق نہایت جامع انداز میں پروفیسر نکلسن کو لکھا :

''میری رائے میں انسان کا اخلاق اور مذہبی منتہائے مقصد یہ نہیں کہ وہ اپنی ہستی کو مٹا دے۔ یا اپنی خودی کو فنا کردے، بلکہ یہ کہ وہ اپنی انفرادی ہستی کو قائم رکھے اور اس کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے اندر بیش از بیش انفرادیت پیدا کرے۔ آنحضرت ؐ نے فرمایا ہے :

تخلقوا باخلاق اللہ ،

یعنی اپنے اندر صفاتِ الٰہیہ پیدا کرو۔ پس انسان جس قدر خدا سے مشابہ ہوگا ، اُسی قدر اُس کے اندر شانِ یکتائی اور رنگِ انفرادیت پیدا ہوتا چلا جائے گا۔''[1]

یہی وجہ تھی کہ خواجہ حسن نظامی کو مخاطب کر کے علامہ اقبال فرماتے ہیں :

''جن لوگوں کے عقائد و عمل کا ماخذ کتاب و سنت ہے ، اقبال ان کے قدموں پر ٹوپی کیا سر رکھنے کو تیار ہے اور اُن کی صحبت کے ایک لحظہ کو دنیا کی تمام عزت و آبرو پر ترجیح دیتا ہے۔''[2]

یہ ایک ایسا بیان ہے جس پر آگے چل کر بحث ہوگی کہ اقبال کے منابع فکر ہی قرآن و سنہ تھے نہ کہ تصوف جیسا کہ بہت سے ناقدین (خصوصاً مغربی ناقدین) نے ادعا کیا ہے کہ وہ تصوف سے متاثر تھے بلکہ نام لے کر گنوایا ہے کہ وہ حسین منصور سے بے حد متاثر تھے۔ اس سلسلے میں تصوف کے مالہ' و ما علیہ پر ایک مختصر سی نظر ڈالنا ضروری ہے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ تصوف اور صوفیاء کے حقیقی عقائد اور اعمال کیا تھے جن سے الگ ہٹ کر اقبال اپنے آپ کو صرف اُن لوگوں کا

---

۱ - ترجمہ از پروفیسر یوسف سلیم چشتی در علامہ اقبال مرحوم ، ص ۱۴ -

۲ - انوارِ اقبال ، ص ۱۸۶ -

پیرو بننے پر ترجیح دیتا ہے جن کے عقائد و عمل کا ماخذ کتاب و سنت ہے۔

یہ صحیح ہے کہ قرآن مجید کی آیات اور حدیث کے حوالے سے استناد کیا گیا ہے کہ قرآنِ مجید میں ایسی آیات موجود ہیں جن کی تعبیر متصوفانہ کی جا سکتی ہے لیکن ایک بات واضح اور یقینی ہے کہ قرانِ مجید یا حدیث میں کہیں بھی تصوف کا ذکر نہیں پایا جاتا؛ مثلاً یہ آیت تصوف کا وجود ثابت کرنے کے لیے دلیل[1] کے طور پر پیش کی جاتی ہے:

ھوالاول و الاخر والظاہر و الباطن و ھو بکل شیٔ علیم (۵۷ : ۳)
(وہی ہر شے کا اول اور ہر شے کا آخر ہے اور ہر شے کا ظاہر ہے اور ہر شے کا باطن ہے اور وہ ہر شے کی ماہیت سے آگاہ ہے)۔

میری سمجھ سے یہ بالاتر ہے کہ آیت محولہ میں خدائے بزرگ و برتر کی جن صفات کا ذکر کیا گیا ہے انھیں کس منطقی انداز میں تصوف کے ذکر سے مربوط کر لیا گیا ہے۔

تعجب انگیز بات یہ ہے کہ تصوف کو قرآن سے ماخوذ کرنے کے سلسلے میں غیر مسلموں بلکہ ہندوؤں کی تبلیغ کو شہادت کے طور پر اکثر مسلمانوں نے سند کے طور پر استعمال کیا ہے مثلاً پروفیسر یوسف سلیم چشتی لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر ڈونالڈسن اپنی کتاب 'مسلمانوں کا فلسفہ' اخلاق' میں صفحہ ۱۹۴ پر لکھتا ہے: 'بقول ابنِ خلدون' صوفیوں نے جو طریقہ اختیار کیا وہ آغازِ اسلام سے مسلمانوں میں متداول تھا''۔
''پروفیسر گیوم اپنی کتاب 'اسلام' میں صفحہ ۱۴۳ - ۱۴۴ پر لکھتا ہے: قرآنی تعلیمات میں دنیا سے بے تعلقی اور تصوف کا رنگ بھی پایا جاتا ہے''۔

---

۱ - تاریخ تصوف: پروفیسر یوسف سلیم چشتی، ص ۱۰۵ -
Mazharuddin Siddiqi, 'Concept of Muslim Culture in Islam', 48.

پروفیسر گب اپنی کتاب 'محمڈن ازم' میں صفحہ ۱۲۸ پر لکھتا ہے : ''پروفیسر میسی نیون نے اسلامی تصوف کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد یہ رائے ظاہر کی ہے کہ مسلمانوں میں تصوف کی تحریک اس زہد و اتقا کا نتیجہ ہے جو قرآن سے ماخوذ ہے اور پیغمبر اسلام کی سنت سے اس کی تائید ہوتی ہے''۔

ڈاکٹر تارا چند اپنی تصنیف 'ہندی ثقافت پر اسلام کا اثر' میں صفحہ ۶۳ پر لکھتے ہیں : ''تصوف کا اصل ماخذ قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہے''۔

پروفیسر ہٹی اپنی تالیف 'تاریخ اقوام عرب' میں صفحہ ۳۳۴ پر لکھتا ہے : ''تصوف کا ماخذ قرآن اور حدیث ہے''۔

پروفیسر براؤن اپنی تالیف 'ایران کی ادبی تاریخ ، جلد اول میں صفحہ ۴۱۸ پر لکھتا ہے : احادیث سے قطع نظر کر کے خود قرآن میں چند آیات ایسی موجود ہیں جن کی تفسیر صوفیانہ انداز میں ممکن ہے''۔ (تاریخ تصوف ۲۵ - ۱۲۲)

ڈاکٹر بنٹ اپنی تالیف مطبوعہ لندن ۱۸۹۳ء صفحہ ۲۰۸ پر لکھتا ہے : ''پروفیسر مارس نے لکھا ہے کہ تصوف دراصل اسلام کی باطنی تعلیم کا نام ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے مبادی قرآن سے اخذ کیے جا سکتے ہیں''۔

لیکن یہ بیانات کس قدر حقیقت سے دور ہیں اس کا اندازہ آپ کو اس امر سے ہوگا کہ تیسری صدی ہجری/نوی صدی عیسوی تک یہ لفظ ایجاد ہی نہیں ہوا تھا ۔ الجاحظ (وفات ۸۶۹/۲۵۶) پہلا آدمی ہے جو اس خطاب کو پہلی دفعہ استعمال کرتا ہے[۹] اور پہلا شخص جس کے لیے یہ کنیت یا لقب استعمال کیا گیا ہے وہ ابو ہاشم کوفی ہے جو ۱۶۲ ہجری میں فوت ہوا ۔ پیر ہرات شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری ہروی کہتے ہیں :

''اول کسی کہ او را صوفی گفتند بو ہاشم صوفی ایذ ۔ شیخ بودہ

---

۹ ۔ تاریخ الفلسفۃ العربیہ خلیل الجار و حنا الفخری ، جلد اول ، ص ۲۹۳ ۔

بشام و باصل کوفیست و بکنیت معروفست ۔ در ایام سفین ثوری بوده و سفین ثوری گوید : لولا ابو ہاشم الصوفی با معرفت دقیق الریا ۔ و گوید : من ندانستم کی صوف چہ بود ؟ تا بو ہاشم صوفی را دیدم ۔ و مات سفین الثوری بالبصرہ سنہ احدی و ستین و مائہ ۔ ۔ ۔ و پیش از وی بزرگان بودند در زہد و ورع و معاملت نیکو در طریق توکل و طریق محبت ۔ لیکن این نام صوفی نخست و ۔ ۔ ۔ گفتہ اند ۔"[1]

(صوفی بو ہاشم پہلا شخص ہے جسے صوفی کہا گیا ہے ۔ وہ شام میں شیخ تھا کو اصلاً کوفی تھا اور (اسی) کنیت سے مشہور ہے ۔ سفیان ثوری کے زمانے میں زندہ تھا ۔ سفیان ثوری کہتا ہے : جب تک میں نے بو ہاشم کو نہیں دیکھا تھا مجھے معلوم نہیں تھا کہ صوفی کیا ہوتا ہے ؟ سفیان ثوری بصرہ میں ۱۶۱ھ میں فوت ہوا اور اس (بوہاشم) سے پہلے بھی بزرگ گزرے ہیں جو زہد و ورع اور نیک معاملے میں طریق توکل اور طریق محبت پر تھے لیکن صوفی کا نام سب سے پہلے اسے ہی دیا گیا ہے) ۔

یہ تو لفظ صوفی اور اس کے استعمال کی ایجاد کی تاریخ ہے جس پر علماء کا اتفاق ہے ۔ یعنی دوسری صدی ہجری/آٹھویں صدی عیسوی تک اس لفظ کا وجود تک قائم نہیں تھا چہ جائیکہ قرآن و سنہ سے اس کا ماخوذ ہونا ثابت ہوتا ہو ۔ اقبال نے اسلام میں عقلیت (Rationalism) کی دخالت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا :

"We are all familiar with the Rationalist movement, which appeared in the church of Islam during the early days of the Abbasides, and the bitter controversies whichit raised .....

The rise and growth of ascetic Sufism, which gradually developed under influences of a non-Islamic character, a purely speculative side, is to a large extent responsible for the attitude. On its purely religious side Sufism fostered a kind

---

۱ ۔ طبقات الصوفیہ ، خواجہ عبداللہ انصاری ، ص ۷ ۔

of revolt against the verbal quibbles of our early doctors. The case of Sufyan Sauri is an instance in point. He was one of the acutest legal minds of his times and was nearly the founder of a school of law ; but their intensely spiritual, the dry-as-dust subtleties of contemporary legist drove him to ascetic Sufism. On its speculative side which developed later, Sufism is a form of free thought and in alliance with rationalism the emphasis that it laid on the distinction of *zahir* and *batin* (Appearance and Reality) created an attitude of indifference to all that applies to Appearance and not to Reality.

'This spirit of total other-worldliness in later Sufism obscured men's vision of a very important aspect of Islam as a social polity, and offering the prospect of unrestrained thought on its speculative side attracted it and finally absorbed the best minds in Islam. The Muslim State was thus left in the hands of intellectual mediocrities, and the unthinking masses of Islam, having no personalities of higher calibre to guide them, found their security only in blindly following the schools."[1]

گویا اقبال کے نزدیک تصوف آزادہ روی اور عقلیت کے مجموعہ کا نام ہے اور اسلام اور حقائق سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس کے باوجود عیسائی ، یہودی اور ہندو اور ان کے طریق پر سوچنے والے اقبال کا منبع الہام تصوف کو بتانے پر مصر ہیں :

صوفی کا لفظ کس طرح ایجاد ہوا ، اس کے متعلق ابھی تک فیصلہ نہیں ہو سکا۔ ابوالحسن قناد کا خیال ہے کہ صوفی صفا سے مشتق ہے اور اس کا اطلاق اہل صفا پر ہوتا ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ جو لوگ کدورت بشریت سے پاک و صاف کر دیے گئے وہ صوفی کہلانے لگے۔ بعض لوگ یہ رائے رکھتے ہیں کہ چونکہ ان لوگوں کا لباس صوف

---

1. Iqbal, Sir Muhammad, *the Reconstruction of Religious Thought in Islam*, 142-143.

(پشمینہ) کا ہوتا تھا اس لیے یہ صوفی کہلائے۔ پھر یہ بھی کہا گیا کہ اصحاب صفہ کے باقیات صالحات صوفی کے لقب سے موصوف ہوئے لیکن دوسری صدی ہجری/آٹھویں صدی عیسوی میں ایجاد ہونے والے اس لفظ کے حامل لوگوں کا حشر چوتھی صدی ہجری میں یہ ہو چکا تھا کہ رسالہ القشیریہ کے مؤلف ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن لکھتے ہیں :

"اس طبقہ کے جو محققین تھے ، ان میں سے اکثر اٹھ گئے اور ہمارے زمانے میں ان لوگوں کی ہی یاد ہی باقی رہ گئی۔ اصل طریقہ گویا مفقود ہی ہو گیا ہے اور حقیقت کے میدان میں سناٹا چھا گیا ہے۔ نہ وہ بوڑھے باقی رہے جن کی راہ پر چلا جائے اور نہ وہ جوان جن کی سیرت اختیار کی جائے۔ زہد و تقویٰ کی بساط ہی الٹ گئی اور حرص و طمع کا دور دورہ آ گیا۔ شریعت کا احترام تک دلوں سے مٹ گیا اور دین کی طرف سے بے پروائی اور آسان ہو گئی۔ احکام کی عظمت نہ رہی اور عبادات ، نماز ، روزہ کی بے وقعتی دلوں میں سما گئی اور غفلتوں اور شہوتوں کی طرف رجحان عام ہو گیا۔"[1]

کشف المحجوب فارسی زبان میں تصوف پر پہلی کتاب ہے جو پانچویں صدی ہجری/گیارہویں صدی عیسوی میں سید علی ہجویری نے لکھی ہے۔ اس میں صوفیوں کے بارہ فرقوں کا ذکر ہے۔ جن میں سے دس مقبول سلسلوں کے نام (محاسبیہ ، قصاریہ ، طیفوریہ ، جنیدیہ ، نوریہ ، سہلیہ ، حکیمیہ ، خرازیہ ، حفیفیہ ، سیاریہ) گنوائے گئے ہیں اور دو کو مردودین اور اہلِ ضلالت کہا گیا ہے۔ ان میں سے ایک سلسلہ حلولیہ ہے جس کا بانی ابوحکمان دمشقی تھا اور دوسرے کا نام فارسی بتایا گیا ہے۔ حلولیہ گروہ کے آدمی ہندوؤں کی طرح تناسخ کے قائل تھے اور فارسی اپنے آپ کو بظاہر حلاج کے پیرو بتاتے تھے۔ سید علی ہجویری (داتا گنج بخش) کہتے ہیں : مجھے ان دونوں فرقوں کے متعلق زیادہ تفاصیل معلوم نہیں۔[2]

۱۔ رسالہ القشیریہ ، ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن القشیری (ص ۲ ، ۳) ترجمہ از عبدالماجد در تصوفِ اسلام ، ص ۸۸۔

۲۔ کشف المحجوب ، سید علی ہجویری ، ص ۱۹۵۔ نفحات الانس جامی۔

اس ساری صورت حالات کو دیکھتے ہوئے اقبال یہ کہنے پر مجبور ہوئے :

"The presence of Christianity was a further contributory factor in the growth of Sufism."[1]

یا یہ کہ :

"It was, however, principally the actual life of the Christian hermit rather than his religious ideas, that exercised the greatest fascination over the minds of early Islamic saints".[2]

اس تمہید سے واضح ہو گیا ہوگا کہ علامہ اقبال تصوف سے اس طرح متاثر نہیں تھے کہ انھوں نے صوفیوں کے نظامِ حیات کی تفاصیل کو مسلمانوں کے لیے قابلِ قبول سمجھا ہو یا اس سے اپنے افکار کو جلا دی ہو بلکہ انھوں نے بڑی وضاحت سے اس طرز حیات کو مشعلِ راہ بنانے سے احتراز کی تلقین کی :

رہا نہ حلقۂ صوفی میں سوزِ مشتاق
فسانہ‌ہائے کرامات رہ گئے باقی

اب حجرۂ صوفی میں وہ فقر نہیں باقی
خونِ دلِ شیراں ہو جس فقر کی دستاویز

وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد
محبت میں یکتا ، حمیّت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا
یہ سالک مقامات میں کھو گیا

اس موقع پر ایک وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ جہاں تک

---

1. Iqbal, M., Metaphyiscs in Persia, 79.
2. Ibid., 80.

۳- بالِ جبریل ، ص ۱۱۸ -

علامہ اقبال کے عقائد کا تعلق ہے اُن کے متعلق یہ مفروضہ درست نہ ہوگا کہ اگر وہ تصوف سے متاثر نہیں تھے تو بزرگانِ دین ، مشایخ یا برجستہ دینی شخصیات سے بھی متاثر نہیں تھے ۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ہر حقیقی عالم کے لیے ہر وقت کلمۂ خیر و احترام کہنے کے لیے آمادہ رہتے تھے جیسا کہ اُن کے نظم و نثر کی تالیفات سے واضح ہے ۔ البتہ مجہول افراد علم و دین سے اُنھیں دلچسپی نہیں تھی ۔ اُنھوں نے اپنی تالیفات میں اسلامی معیاری مردانِ کامل کے لیے مردِ قلندر ، مردِ مومن اور مردِ حر کے تعریفی کلمات استعمال کیے ہیں ۔ اس کے لیے اُن کا منبع فکر اور مشعلِ ہدایت مثنوی مولانا روم تھی جس میں بات توحید و رسالت سے شروع کر کے انسان کے فعل کا معیار پرتوِ صفاتِ باری تعالیٰ کو قرار دیا گیا ہے :

فعل حق و فعل ما ہر دو ببیں

(اگر ہمارے اعمال کو جانچنا ہے تو فعل حق کو سامنے رکھو) ۔

اور جس میں یونانیوں کی حکمت (جو اقبال کے بقول اسلامی تصوف کی بنیاد ہے) سے دور رہ کر صرف اہلِ ایمان کی پیروی کی تلقین کی گئی ہے :

تابکی از حکمتِ یونانیاں
حکمت ایمانیاں را ہم بخواں

(یونانیوں کی حکمت کے پیچھے کب تک دوڑتے رہو گے ۔ اہلِ ایمان کی حکمت کو بھی سمجھنے کی کوشش کرو) ۔

مولانائے روم جس کو اقبال اپنا مرشد مانتے ہیں ، خود بھی یونانی حکمت کو مردود قرار دے رہے ہیں اور اُسی خود نگری کا درس دیتے ہیں جسے اقبال نے ''تحفظ خودی'' کے عنوان سے طویل مباحث کا موضوع بنایا ہے ، جن کا ذکر آگے آئے گا :

گر تو خواہی از درونِ خود بخواں

چارہ آں باشد کہ خود را بنگرم

اور اقبال اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے :

زندہ ای یا مردہ ای یا جاں بلب
از سہ شاہد کن شہادت را طلب

شاہد اول شعور خویشتن
خویش را دیدن بنور خویشتن

(تم زندہ ہو یا مردہ یا مرنے کے قریب ہو، بہرصورت اپنے آپ کو جانچنے کے لیے تمھیں تین منابع سے شہادت لینی چاہیے۔ سب سے پہلا شاہد اپنے آپ کا شعور ہے یعنی اپنے آپ کو قلبِ منور سے جانچنا ہے)۔

انسان کو جانچنے کا یہی معیار سکھانے والے کو اقبال اس لیے اپنا مرشد قرار دیتا ہے کہ وہ راستبازی کا معراج ہے:

پیر رومی آں امامِ راستاں
آشنائے ہر مقامِ راستاں

(مولانا روم راستبازوں کے امام ہیں اور ان کے ہر مقام کو پہچانتے ہیں)۔

اقبال کے امام راستاں رومی نے ''مردِ خدا'' کی جو تعریف کی ہے آپ بھی سن لیں تاکہ اقبال کو سمجھنے میں آسانی ہو:

مردِ خدا شاہ بود زیر دلق
مردِ خدا گنج بود در خراب
مردِ خدا نیست ز باد و ز خاک
مردِ خدا نیست ز نار و ز آب
مردِ خدا بحر بود بی کران
مردِ خدا بارد درِ بی حساب
مردِ خدا عالمی از حق بود
مردِ خدا نیست فقیہ کتاب
مردِ خدا زاں سوی کفرست و دین
مردِ خدا را چہ خطا و صواب

مردِ خدا گودڑی پہنے ہوئے بھی بادشاہ ہوتا ہے۔
وہ اس خزانے کی مانند ہے جو ویرانے میں مستور ہے۔
مردِ خدا ہوا اور خاک کا بنا ہوا نہیں ہوتا۔

وہ آگ اور پانی سے بھی نہیں بنتا ۔
وہ تو ایک بحر بے کنار ہے جو بے حساب موتی برساتا رہتا ہے ۔
مردِ خدا صحیح معنوں میں خدا کو پہچاننے والا ہوتا ہے ۔
وہ صرف کتابیں پڑھ کر قانون داں نہیں بن جاتا ۔
مردِ خدا ایسا دین دار ہوتا ہے جس سے کفر کبھی سرزد نہیں ہوتا
لہٰذا وہ صرف نیکی ہی نیکی کرتا ہے اور کبھی خطا نہیں کرتا ۔

☆ ☆ ☆

اقبال اور دین

اقبال نے دین اسلام کے متعلق اپنی ساری زندگی میں صرف ایک ہی نظریے سے وابستگی کا اظہار کیا اور وہ یہ تھا کہ یہ ایک ایسا ہمہ جہتی اُصول ہے جس نے حیاتِ انسانی اور آخرت کے ہر پہلو کے متعلق انسان کو رشد و ہدایت سے بہرہ ور کیا ہے :

ہستی دین مصطفٰی ؐ دین حیات شرح او تفسیر آئینِ حیات[1]

(دین مصطفٰی ؐ زندگی کا دین ہے اور اس کی شرح زندہ رہنے کے آئین کی تفسیر ہے) ۔

جب ہم یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ اقبال صرف اسلام کو ہی دین حیات سمجھتا ہے تو پھر یہ بات از خود خارج از بحث ہو جاتی ہے کہ علامہ کی سوچ پر تصوف اور متصوفین کا بھی استیلا تھا کیونکہ اسلام کی طرف راہ نمائی تصوف سے نہیں بلکہ صرف قرآن مجید سے ہوتی ہے ۔ قرآن مجید کے متعلق علامہ کی فکر کس نہج پر تھی ، اس کے متعلق ایک دو چشم دید شہادتیں سن لیں ۔ کرنل سید وحید الدین لکھتے ہیں :

''ڈاکٹر صاحب ان دنوں میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں قیام فرما تھے ۔ اس زمانے میں ڈاکٹر صاحب کی قیام گاہ پر ایک نئے ملاقاتی آئے ۔ ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں ۔ اتنے میں اُنھوں نے ڈاکٹر صاحب سے ایک سوال کر دیا ، کہنے لگے : آپ نے مذہب ، اقتصادیات ، سیاسیات ، تاریخ اور فلسفہ وغیرہ ، علوم پر جو کتابیں اب تک پڑھی ہیں ، ان میں سب سے زیادہ بلند پایہ اور حکیمانہ کتاب آپ کی نظر

۱- رموزِ بے خودی ، ص ۱۲۸ ۔

سے کون سی گزری ہے ؟ ڈاکٹر صاحب اس سوال کے جواب میں کرسی سے اٹھے اور نووارد ملاقاتی کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا کہ تم ٹھہرو ، میں ابھی آتا ہوں ۔ یہ کہہ کر وہ اندر چلے گئے ، دو تین منٹ میں واپس آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی ۔ اس کتاب کو انھوں نے اس شخص کے ہاتھوں پر رکھتے ہوئے فرمایا : قرآن کریم ۔"[1]

یعنی ان کی ذہنی اور قلبی اثر پذیری صرف ایک ہی کتاب سے ہوئی تھی ، وہ کتاب قرآن مجید ہے ۔ البتہ بعض علماء کے خیالات سے انھیں اتفاق نہ تھا ۔ اس کی مثال وہ مکالمہ ہے جو ان کے اور محمد حسین قریشی صاحب کے درمیان ہوا ۔ مکالمہ کچھ یوں ہے :

قریشی صاحب : معرفت الٰہی سے کیا مراد ہے ؟

علامہ صاحب : جنید بغدادی" کے نزدیک معرفت یا عرفان کا لفظ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب یا مضاف نہیں کرنا چاہیے کیونکہ قرآن عزیز میں اس کا استعمال نہیں کیا گیا ۔ البتہ علم و ایمان کا ذکر بار بار آتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ نہ تو عارف ہے نہ معروف ، ہاں عالم و علیم ہے جس پر بہت سی آیتیں شاہد ہیں :

انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء[2]

(اللہ تعالیٰ سے وہی لوگ ڈرتے ہیں جو اس کے بندوں میں علم سے ممتاز ہیں) ۔

یہاں علماء کہا گیا ہے عرفا نہیں کہا ۔[3]

اس مختصر سی وضاحت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ علامہ صاحب قرآن مجید کی حدود میں رہ کر انسان کو یہ حق بھی دینے کے لیے تیار نہ

۱- روزگار فقیر ، کرنل سید وحید الدین ، جلد اول ، ص ۲۰-۲۱ ۔
۲- قرآن مجید ، ۳۵ : ۲۸ ۔
۳- ملفوظات اقبال 'محمود نظامی' ، ص ۴۴-۵۲ ۔

تھے کہ کوئی معرفتِ الٰہی کا ادعا کرے کیونکہ قرآن مجید میں ایسی کوئی بات نہیں کہی گئی۔

۱۲ اپریل ۱۹۳۵ء کی اسی ملاقات میں عرشی صاحب نے علامہ صاحب سے استفسار کیا۔

''اسلام بتمامہ قرآن میں محصور ہے یا نہیں؟

فرمایا: مفصل کہو۔

میں نے کہا: خارج از قرآن، ذخیرۂ احادیث و روایات اور کتاب و فقہ وغیرہ کو شامل کر کے اسلام مکمل ہوتا ہے یا صرف قرآن اس باب میں کفایت کرتا ہے؟

آپ نے فرمایا: یہ چیزیں تاریخ اور معاملات پر مشتمل ہیں۔ ان کی بھی ضرورت ہے۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کن ضروریات کے ماتحت وضع کی گئی ہیں لیکن نفس اسلام قرآن مجید میں باکمال اور تمام آ چکا ہے۔ خدائے تعالیٰ کا منشا معلوم کرنے کے لیے ہمیں قرآن سے باہر جانے کی ضرورت نہیں۔''[1]

میں نے ابھی عرض کیا کہ علامہ اسلام کو نہ صرف اس دنیا کی زندگی کے لیے بہترین لائحہ حیات سمجھتے تھے بلکہ آخرت کے لیے بھی۔ انگلستان میں گول میز کانفرنس کے موقع پر آپ نے فرمایا:

''اسلام انسان کو ایک زندہ شخصیت تصور کرتا ہے اوز یہ تصور قرآن میں نہ صرف اس ارضی زندگی کے لیے استعمال ہوتا ہے بلکہ حشر اور حیات بعدالموت کے لیے بھی قائم رہتا ہے چنانچہ حیات بعدالموت میں انسان کے لیے جو جزا اور سزا مقرر ہے، جس کا ذکر قرآن میں بار بار آتا ہے، وہ روحانی بھی ہے اور جسمانی بھی۔''[2]

۱۔ ملفوظاتِ اقبال، محمود نظامی، ص ۵۵-۶۴۔

۲۔ آثارِ اقبال، ص ۷۲-۷۳۔

اسلام کے متعلق علامہ کا اتنا پختہ ایمان ہر انسان کو یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ اس کا صحیح مفہوم اُن کے ذہن میں کیا تھا۔ یہ عام طور پر معلوم ہے کہ اسلام کی بنیاد عقیدۂ توحید ہے۔ چنانچہ علامہ نے رموزِ بے خودی میں بات ہی اس عقیدے کی تبلیغ سے شروع کی ہے اور توحید کو رکنِ اول اساسِ ملتِ اسلامیہ قرار دیا ہے :

اہلِ حق را رمزِ توحید ازبر است
در اتی الرحمٰن عبداً مضمر است[1]

(اہلِ حق نے توحید کی رمز کو یاد کر رکھا ہے اور وہ اس آیت میں مضمر ہے کہ "زمین اور آسمانوں کے اندر جو بھی ہیں سب اس کے حضور بندوں کی حیثیت سے پیش ہونے والے ہیں)۔"

اس عہد میں رموزِ بے خودی کی تالیف کے وقت یوں معلوم ہوتا ہے جیسے قرآن مجید کا فکر اقبال پر مکمل استیلا تھا اور وہ بار بار اس سرچشمۂ رشد و ہدایت سے نہ صرف استفادہ کرتے ہیں بلکہ اپنی بات آگے بڑھانے کے لیے آیات کے حوالے بے تکلف طور پر دیتے جاتے ہیں :

ما مسلمانیم و اولادِ خلیل از ابیکم گیر اگر خواہی دلیل

(ہم مسلمان ہیں اور اولادِ خلیل ہیں۔ اگر ثبوت کی ضرورت ہے تو اس آیت کو دیکھ لو : "اپنے باپ ابراہیم کی ملت پر قائم ہو جاؤ۔ اللہ نے پہلے بھی تمہارا نام مسلم رکھا تھا اور اس (قرآن) میں بھی (تمہارا نام یہی ہے)۔"[2]

عقیدۂ توحید کے ساتھ مسلمان نے کیا سلوک کیا، اس پر تنقید فرماتے ہوئے علامہ کہتے ہیں :

حق تعالیٰ پیکر ما آفرید وز رسالت در تن ما جاں دمید
از رسالت در جہاں تکوین ما از رسالت دینِ ما آئین ما

۱- رموزِ بے خودی، ص ۹۱۔
۲- آیت کا مکمل ترجمہ پیش کر دیا گیا ہے۔ (۹۳-۱۹)۔
۳- آیت کا مکمل ترجمہ پیش کر دیا گیا ہے، (۲۲:۷۸)۔

از رسالت صد ہزار ما یک است　　جزو ما از جزو ما لاینفک است
آن کہ شان اوست یھدی من یرید　　از رسالت حلقہ گرد ما کشید
ما ز حکم نسبت او ملتیم　　اہل عالم را پیام رحمتیم

(اللہ تعالیٰ نے ہمارا جسم بنایا تو رسالت سے اس تن میں روح پھونکی - ہماری تکوین اسی دنیا میں رسالت کی بدولت ہے - ہمارا دین اور ہمارا آئین رسالت کے طفیل ہے - رسالت کی وجہ سے ہی ہمارے لاکھ ٹکڑے اکائی کی شکل اختیار کر گئے ہیں - ہمارا کوئی حصہ بھی دوسرے حصے سے الگ نہیں ہو سکتا - جو اس شان کا مالک ہے کہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے ، اس نے ہمارے گرد رسالت کا حصار کھینچ دیا اور اس سے نسبت رکھنے کی وجہ سے ہم ایک ملت ہیں اور دنیا والوں کے لیے پیام رحمت) -

ان اشعار میں گو ایک تلمیح کے سوا قرآن مجید کی کوئی آیت نقل نہیں کی گئی لیکن ان پر غور کریں تو واضح ہو جاتا ہے کہ نہ صرف مواد فکر بلکہ الفاظ تک قرآن مجید سے اخذ کیے گئے ہیں -

رسالت کی برکات اور رسالت کا مفہوم معین علامہ نے یوں واضح کیا ہے -

از رسالت ہم نوا گشتیم ما　　ہم نفس ہم مدعا گشتیم ما
کثرت ہم مدھا وحدت شود　　پختہ چوں وحدت شود ملت شود
زندہ ہر کثرت زبند وحدت است　　وحدت مسلم ز دین فطرت است
دین فطرت از نبی آموختیم　　در رہ حق مشعلے افروختیم
پس خدا برما شریعت ختم کرد　　بر رسول ما رسالت ختم کرد
لا نبی بعدی ز احسان خداست　　پردۂ ناموس دین مصطفیٰ است[1]

(رسالت کی بدولت ہم ایک دوسرے کے ہمنوا ہوئے اور ہم نفس اور ہم مدعا ہو گئے - بہت سے ہم مدعا مل جائیں تو اکائی

---

۱ - رموز بے خودی ، ۱۰۲
وکذالک انزلنہ آیات بینت و ان اللہ یھدی من یرید (۲۲ : ۱۶)
(اور یوں اتارا ہم نے یہ قرآن کھلی باتیں اور یہ اللہ ہے جسے چاہے سوجھ دیتا ہے -)

بن جاتی ہے - ہر کثرت اکائی کے بندھن سے ہی زندہ ہے اور مسلمانوں کی وحدت دینِ فطرت کا پیرو ہونے کی وجہ سے ہے - یہ وہ دین فطرت ہے جسے ہم نے نبی سے سیکھا ہے اور جس کی طفیل ہم نے راہ حق میں مشعل (ہدایت) روشن کی ہے - (اس وجہ سے) اللہ تعالیٰ نے ہم پر شریعت تمام کی اور ہمارے رسولؐ پر رسالت ختم کی - (گویا رسول مقبولؐ کا یہ کہنا کہ) میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا ، اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان اور دین مصطفیٰ کے ناموس کا محافظ ہے) -

اس سارے بیان کو دیکھیں تو پھر توجہ قرآن مجید کی ان آیات کی طرف جاتی ہے جن میں یہ فرمایا گیا ہے کہ

واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً و لا تفرقوا و اذکروا نعمت اللہ علیکم اذ کنتم اعداءً فالّف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا و کنتم علیٰ شفا حفدۃٍ من النار فانقذکم منھا'' ۳ : ۱۰۳)

(تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑلو اور تفرقہ میں نہ پڑو - اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا ہے - تم ایک دوسرے کے دشمن تھے - اس نے تمہارے دل جوڑ دیئے اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے - تم آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے کھڑے تھے ، اللہ نے تم کو اس سے بچالیا) - فا قم وجھک للدین حنیفاً ، فطرت اللہ التی فطر الناس علیھا لا تبدیل لخلق اللہ (۳۰ : ۳۰)

پس یک سو ہوکر اپنا رخ اس دین کی سمت میں جمادو - قائم ہو جاؤ اس فطرت پر جس پر اللہ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے - اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدل نہیں جاتی) -

الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی ، (۵ : ۳)

(آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کردیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کردی ہے)

توحید و رسالت کے مضامین سے بحث کرتے ہوئے خود علامہ نے متعدد مقامات پر حواشی میں آیات نقل کردی ہیں یا ان تلمیحات کا ذکر کیا ہے جو آیات پر مبنی ہیں ۔ وہ قرآن مجید کو اپنی تبلیغات کا محور بنانے پر اس قدر مصر ہیں کہ ان کے یہ بیانات نظم و نثر آیات کے مفاہیم کے دائروں سے کسی طرح بھی باہر نہیں جاتے ۔ اس لیے یہ کہنا کہ وہ اپنی فکر یا کسی اور عقیدے سے بھی متاثر ہوئے دور از کار بات ہے ۔

توحید و رسالت کے بنیادی عقیدۂ اسلام کے علاوہ انسانی معاشرے اور فرد کے لیے دین جو احکامات دیتا ہے مثلاً اخوت ، مساوات ، عبادات ، جذبہ حریت ، اتفاق ، اتحاد اور ایک قوم ہونے کا تصور وغیرہ ، فرد اور ملت کا ربط ان تمام کو علامہ خالص اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھ کر ان کی تبلیغ کرتے ہیں اور دائرہ دین سے خارج کوئی بات نہیں کرتے ۔ اپنی تبلیغ کے لیے وہ آیات قرآن یا احادیث نقل کرتے چلے جاتے ہیں اور اگر آیت یا حدیث کا کچھ حصہ تلمیح کے طور پر استعمال ہوا ہے تو انھوں نے خود حواشی میں مکمل آیت یا حدیث نقل کردی ہے جس سے اس امر کی بھی وضاحت ہوتی ہے کہ قرآن و حدیث پر ان کی کتنی گہری نظر تھی کہ وہ روا روی میں بھی ان سے مؤثر طور پر استفادہ کر لیتے تھے یہاں تک کہ نبی کریم کے بعض ارشادات انھیں اس طرح ازبر تھے کہ اپنے کلام میں سمو کر اُن سے حیرت انگیز نتائج پیدا کرتے تھے ۔ پیام مشرق میں آپ نے نیٹشا کے متعلق ایک مختصر سی نظم لکھی ہے ، جس کا ایک شعر ہے :

آنکہ بر طرز حرم بت‌خانہ ساخت
قلبِ او مومن دماغش کافراست
(ص ، ۲۰۱)

(اس (نیٹشا) نے حرم کے طرز پر بت خانہ بنایا کیونکہ اس کا دل مومن لیکن دماغ کافر کا تھا)۔

اور پھر حاشیہ میں علامہ نے خود ہی اس بات کا ذکر کر دیا ہے کہ اس شعر کی بنیاد رسول کریم کے قول پر رکھی گئی ہے ؛ آپ لکھتے ہیں :

نیٹشا نے مسیحی فلسفۂ اخلاق پر زبردست حملہ کیا ہے ۔ اس کا

دماغ اس لیے کافر ہے کہ وہ خدا کا منکر ہے ۔ گو بعض اخلاقی نتائج میں اس کے افکار مذہب اسلام کے بہت قریب ہیں ۔ ''قلب او مومن دماغش کافراست'' نبی کریمؐ نے اس قسم کا جملہ امیہ ابن الصلت (عرب شاعر) کی نسبت کہا تھا ۔ ''آمن لسانہ و کفر قلبہ''

حدیث سے شغف اور اعتقاد کی کیفیت کو مولانا مودودی نے ۱۹۳۸ء میں یوں بیان فرمایا :

''ایک مرتبہ ایک صاحب نے ان (اقبال) کے سامنے بڑے اچنبھے کے انداز میں اس حدیث کا ذکر کیا جس میں بیان ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اصحاب ثلاثہ کے ساتھ کوہِ اُحد پر تشریف رکھتے تھے ۔ اتنے میں اُحد لرزنے لگا ۔ حضور نے فرمایا کہ ٹھہر جا ۔ تیرے اوپر ایک نبیؐ ، ایک صدیق اور دو شہیدوں کے سوا کوئی نہیں ہے ۔ اس پر پہاڑ رک گیا ۔'' اقبال نے حدیث سنتے ہی کہا کہ اس میں اچنبھے کی کون سی بات ہے ۔ میں اس کو استعارہ و مجاز نہیں بالکل ایک مادی حقیقت سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک اس کے لیے کسی تاویل کی حاجت نہیں ۔ اگر تم حقائق سے آگاہ ہوتے تو تمھیں معلوم ہوتا کہ ایک نبی کے نیچے آ کر مادے کے بڑے سے بڑے تودے بھی لرز جاتے ہیں ۔ مجازی طور پر نہیں واقعی لرز اٹھتے ہیں ۔''[1]

اس موقع پر ضمناً اس حقیقت کے اظہار کی بھی ضرورت ہے کہ علامہ کے متعلق ان کے نام نہاد مداحوں یا مخالفین نے جو یہ رائے قائم کرنے کی جسارت کی ہے کہ وہ صرف عقیدۃً مسلمان تھے وہ کس قدر غلط ہے ۔ صرف مولانا مودودی کا ایک بیان ملاحظہ ہو :

'اقبال کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ وہ فقط اعتقادی مسلمان تھے ، عمل سے اُن کو کوئی سروکار نہ تھا ۔ بدگمانی پیدا کرنے میں خود اُن کی افتاد طبیعت کا بھی بہت کچھ دخل ہے ۔ اُن میں کچھ فرقہ ملامتیہ کے سے میلانات تھے جن کی بنا پر اپنی رندی کے اشتہار دینے میں اُنھیں کچھ مزہ آتا تھا ۔ ورنہ در حقیقت وہ اتنے بے عمل

---

۱ ۔ مجلہ جوہر (اقبال نمبر) ، جامعہ ملیہ ، دہلی ، ۱۹۳۸ء ۔

نہ تھے ۔ قرآن مجید کی تلاوت سے اُن کو خاص شغف تھا اور صبح کے وقت بڑی خوش الحانی کے ساتھ پڑھا کرتے تھے مگر اخیر زمانے میں طبیعت کی رقت کا یہ حال ہوگیا کہ تلاوت کے دوران میں روتے روتے ہچکیاں بندھ جاتی تھیں اور مسلسل پڑھ ہی نہ سکتے تھے ۔ نماز بھی بڑے خشوع و خضوع سے پڑھتے تھے مگر چھپ کر ؛ ظاہر میں یہی اعلان تھا کہ میں نرا گفتار کاغازی ہوں ۔''[1]

قرآن مجید اور حدیث سے علامہ کا حقیقی عشق ان بیانات سے بھی مترشح ہے جو انھوں نے بسا اوقات کسی حوالے کے بغیر دیے ہیں ۔ شیخ الاسلام حافظ ابن قیم الجوزی نے اپنی مشہور تالیف 'اسلامی تصوف' میں لکھا ہے :

''اگر تم اپنی ماضی کی زندگی پر غور کرو تو تمھیں معلوم ہو کہ کتنے موقعوں پر انھوں (عزیز و اقارب) نے تم کو اپنے دین اور دنیا کے مصالح سے باز رکھا اور تمھاری آخرت کے مدارج ترقی طے کرنے کے راستہ میں حائل اور سنگِ راہ ثابت ہوئے ۔ ان کا دعویٰ یہ ہوتا ہے کہ تمھارے مخلص دوست و احباب ' جاں نثار ، خدام اور پیارے عزیز و اقارب ہیں لیکن بخدا ان کا یہ دعویٰ سراسر نمائشی ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے :

یا ایھاالذین آمنو یا لا تلھکم اموالکم ولا اولادکم عن ذکراللہ و من یفعل ذالک فأولئک ھم الخاسرون ، (۹ : ۶۳)

(مومنو ! تمھارا مال اور تمھاری اولاد تم کو خدا تعالیٰ کی یاد سے غافل نہ کردے اور جس کسی نے ایسا کیا وہ یقیناً گھاٹے میں رہیں گے ۔)[2]

ملاحظہ فرمائیں اس مفصل بحث کو حضرت علامہ اقبال نے کس

---

۱ ۔ مجلہ جوہر (اقبال نمبر) ، جامعہ ملیہ ، دہلی ، ۱۹۳۸ء ۔
۲ ۔ اسلامی تصوف ، حافظ ابن قیم الجوزی ، ۱۵۳ ۔

خوبصورتی سے دو مصرعوں میں سمیٹا ہے :

یہ مال و دولتِ دنیا یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لا الہ الا اللہ

قرآن پاک اور حدیث سے وابستگی اور انھیں اپنے افکار ملی کے لیے محور کے طور پر استعمال کرنے کے بعد علامہ نے جس موضوع سے اپنے قارئین کو متاثر کیا ہے وہ ''خودی'' ہے ۔ اس کے متعلق عوام تک بالعموم یہ صراحت نہیں پہنچائی گئی کہ علامہ کی تبلیغ استحکام خودی کی محرک بھی قرآن مجید کی ایک آیت تھی جس کا ذکر انھوں نے خود پروفیسر سلیم چشتی[1] سے کیا تھا ۔ یہ سورۃ المائدہ کی آیت ۱۰۵ ہے :

یاایھا الذین آمنو علیکم انفسکم لایضرکم من ضل اذا اھتدیتم الی اللہ مرجعکم جمیعاً فینبئکم بما کنتم تعملون ۔

(اے لوگو ! جو ایمان لائے ہو ، تم پر فرض ہے خودی کی محافظت ۔ اگر تم ہدایت پر ہو تو وہ شخص جو گمراہ ہے ، تمھیں کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا ۔ تم سبھوں کو اللہ ہی کے پاس واپس جانا ہے اور وہ تمھیں تمھارے اعمال سے مطلع کر دے گا (تاکہ ان کے مطابق جزا و سزا مل سکے) ۔

یعنی خودی کے تحفظ کی تلقین اس آیت میں کی گئی ہے اور علامہ کے لیے یہی منبع الہام بنی جس میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ انسان کو دیکھنا چاہیے کہ وہ خود کیا کر رہا ہے ۔ خدا اور بندوں کے جو حقوق اس پر عائد ہوتے ہیں ، انھیں ادا کر رہا ہے یا نہیں اور راست روی اور راستبازی کے مقتضیات اس سے پورے ہو رہے ہیں یا نہیں ۔ ان میں لازماً امر بالمعروف و نہی عن المنکر بھی شامل ہے ۔

اس آیت کا یہ منشا ہرگز نہیں کہ بس اپنی نجات کی فکر کرے اور دوسروں کی اصلاح نہ کرے ۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس غلط فہمی کی

۱- روزگارِ فقیر ، وحید الدین ، ص ۱۷۹-۱ ۔

تردید کرتے ہوئے اپنے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا:

لوگو! تم اس آیت کو پڑھتے ہو اور اس کی غلط تاویل کرتے ہو۔ میں نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جب لوگوں کا یہ حال ہو جائے کہ برائی کو دیکھیں اور اسے بدلنے کی کوشش نہ کریں، ظالم کو ظلم کرتے ہوئے پائیں اور اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو بعید نہیں کہ اللہ اپنے عذاب میں سب کو لپیٹ لے۔ خدا کی قسم تم کو لازم ہے کہ بھلائی کا حکم دو اور برائی سے روکو، ورنہ اللہ تم پر ایسے لوگوں کو مسلط کر دے گا جو تم میں سب سے بدتر ہوں گے اور وہ تم کو سخت تکالیف پہنچائیں گے۔ پھر تمہارے نیک لوگ خدا سے دعائیں مانگیں گے مگر وہ قبول نہ ہوں گی۔[1]

علامہ کی اسرار و رموز، کا سارا خاکہ اور نقشہ اس آیت اور اس کی تفسیر کا مرہونِ منت ہے۔

شیخ محمد بن علی ابو طالب مکی (وفات ۳۸۳-۸۷ھ) اپنی مشہور تالیف قوت القلوب میں فرماتے ہیں کہ

''ہرچہ گاہ از علماء مسئلہ ای سوال کنی چنیں سوال کن کہ دریں مسئلہ خدائے و رسول چہ فرمودہ است، یا صحابہ دریں مسئلہ چہ حکم کردہ اند۔ اگر آن عالم، آن را بیان کند غرض تو حاصل آید و اگر قول خدائے را و رسول را نگوید از اختلاف و اقاویل ایمہ گوید ترا باری معلوم شو کہ او دریں مسئلہ حکم خدای را و رسول را نمی داند بروی و از کسی پرس کہ خدای و رسول را داند تا بہ آن عمل کسی کہ خدای و رسول فرمودہ است۔''[2]

(جب تم کسی مسئلہ کے متعلق علماء سے استفسار کرو تو یوں سوال کرو کہ اس مسئلہ کے متعلق خدا اور رسول نے کیا فرمایا ہے؟

۱۔ تفہیم القرآن، ابوالاعلی مودودی، ص ۱۰۰-۱۰۱۔

۲۔ بنقل از اوراد الاحباب و فصوص الآداب۔ ابو المفاخر یحیٰی باخرزی، ص ۳۴۲-۳۴۳۔

یا صحابہ نے اس مسئلہ کے متعلق کیا حکم دیا ہے ۔ اگر وہ عالم بیان کرے تو تمھارا مقصد پورا ہو جاتا ہے لیکن اگر خدا اور رسول کا قول نہ کہے اور آئمہ کے اختلاف اور اقوال سنائے تو تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ اس مسئلہ کے متعلق خدا اور رسول کا حکم نہیں جانتا ۔ پھر تمھیں (وہاں سے) چلے جانا چاہیے اور کسی ایسے آدمی سے پوچھنا چاہیے جو خدا اور رسول کے حکم کو جانتا ہو تا کہ تم اس پر عمل کرو جو خدا اور رسول نے فرمایا ہے) ۔

ملی افکار کی وضاحت کے سلسلے میں علامہ کی تکنیک بھی مسلسل یہ رہی ہے کہ وہ کسی مسئلہ کے متعلق بھی خدا اور رسول کے دائرے سے باہر نہیں نکلتے ۔ یہاں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ بعض اقبال شناسوں نے بزعم خویش اور آن کے بعض قریبی بیٹھنے والوں نے زیبِ داستاں کے لیے ایسی روایات کو جنم دیا ہے جن سے آن کے فکر و عمل میں تضاد نظر آتا ہے ۔ انفرادی تردید کے لیے ان داستانوں کا دہرانا مفید نہ ہوگا لیکن فقیر بڑے ادب سے ان بزرگوں کی خدمت میں صرف یہ عرض کر سکتا ہے کہ بدوِ شعور سے اسے خود بھی اقبال کو دور سے دیکھنے کا شرف حاصل ہوا ہے ۔ دور سے اس لیے کہ قریب بیٹھ کر بھی وہ اپنی علمی نارسائی کی وجہ سے اقبال سے کسی علمی مبحث پر بات کرنے کی جسارت نہیں کر پاتا تھا ۔ لیکن اس بات کی شہادت دے سکتا ہے کہ آس نے اقبال کو کبھی ان معائب میں ملوث نہیں دیکھا جن کا ذکر بعض دفعہ یاران سرپل کا ادعا کرنے والے کرتے ہیں ۔

یہ شہادت اس لیے درج کرنا پڑی تا کہ ان تبلیغات کے خلوص اور اثر پذیری میں حال اور استقبال کی نسلوں کو شبہ رہے جو معاشرے کو ان خطوط پر تعمیر اور بحال کرنا چاہتے ہیں جو اقبال نے تجویز کیے تھے ۔ بلکہ یہ کہنا پڑے گا کہ تاسیس پاکستان سے اس وقت تک جو مساعی علامہ کے متعلق تشکیک کا ہنگامہ گرم کرنے کے سلسلے میں کی گئی ہیں ان کا ہدف صرف ایک ہے کہ علامہ کی جو سوچ پاکستان پر منتج ہوئی ، وہ اور اس کا نتیجہ پاکستان اس لیے غلط ہیں کہ اس مردِ خدا کے اپنے فکر و عمل میں تضاد تھا ۔ یہ لوگ معلوم اغراضِ مشکوکہ کے تحت اس تبلیغ میں مصروف ہیں کہ ملتِ اسلامیہ پاکستان نے کبھی طرزِ حیات کو

اسلامی سانچے میں مکمل طور پر ڈھالنے کا عزم ہی نہیں کیا تھا لہذا اس پر اصرار مناسب نہیں۔ اچھی زندگی گزارنے کے لیے اور بھی کئی طریقے اب تک ایجاد ہو چکے ہیں اور ان میں سے کسی ایک کو اپنا لینا چاہیے اور اس سلسلے میں علامہ کی تحریریں، بیانات اور انتخابات نظم و نثر سند کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔ حالانکہ علامہ کی فکر دینِ اسلام کی برتری اور فضیلت اور خدا اور رسول کے ارشادات کی پیروی سے آگے کہیں نہیں جاتی اور ان کے جذباتِ تعمیرِ ملت کا محور صرف اسلام ہے۔

اس صورتِ حال میں یہ تجویز کرنا بھی ضروری معلوم ہوا کہ یونیورسٹی نے جو شعبۂ اقبالیات قائم کر کے احترامِ اقبال کے اظہار کی درخشاں مثال قائم کی ہے اگر اس کے ساتھ اسلام سے شغف رکھنے والے اساتذہ کے توسط سے اقبال کے ان افکار کی تدریس کا سامان بھی ہو جاتا جو تعمیرِ ملت کے سلسلے میں علامہ کی تخلیقات نظم و نثر اردو، فارسی اور انگریزی میں فراوانی سے دستیاب ہیں تو یہ مبارک کام بحسن و خوبی ایک منطقی نتیجے تک پہنچ جاتا۔ اقبال دشمنی کی تحریکیں نہ صرف اس ملک میں چل رہی ہیں کیونکہ ان ہی سے استحکام پاکستان اور پاکستان کی بنیادوں پر حملہ کیا جا سکتا ہے بلکہ خارجی ممالک تک یہ زہر سرایت کر گیا ہے۔

جیسا کہ ابتداء میں ہی عرض کیا گیا ہے اقبال اس صدی کا محسنِ انسانیت مفکر ہے اور اس اعتبار سے سب سے بڑا آدمی ہے کہ اس نے پہلی دفعہ دنیا سے کہا:

آدمیت احترام آدمی

یا

برتر از گردوں مقامِ آدم است　　اصل تہذیب احترام آدم است[1]

اور پھر آدمی کی تعریف اس نے یوں کی:

مرد حر دریائے ژرف و بیکراں　　آب گیر از بحر و نے از ناوداں

۱- جاوید نامہ، ص ۶۹۔

سینۂ ایں مرد می جوشد چو دیگ	پیش او کوہ گراں یک تودہ ریگ
در جہانِ بے ثبات او را ثبات	مرگ او را از مقامات حیات
روز صلح آں برگ و ساز انجمن	ہم چو بادِ فرودیں اندر چمن

آزاد آدمی تو گہرا اور بے کنارہ سمندر ہے۔
وہ ناوداں کی بجائے بحر سے پانی پیتا ہے۔
اس آدمی کا سینہ دیگ کی طرح جوش کھاتا رہتا ہے
اور اس کے سامنے بڑا پہاڑ ریت کا ٹیلہ ہے۔
فانی دنیا میں صرف اسے ہی دوام حاصل ہے۔
موت تو اس کی زندگی کے مقامات کا ایک مرحلہ ہے۔
صلح کے دوران وہ اس طرح محفلیں سجاتا ہے جیسے چمن میں بادِ بہاری۔

☆ ☆ ☆

۱- مثنوی پس چہ باید کرد ، ۲۶ -

کتابیات

۱۔ آثار اقبال (حیدر آباد دکن) ، ۱۹۴۶ء -
۲۔ اسلامی تصوف ، شیخ الاسلام حافظ ابن قیم الجوزی ، لاہور -
۳۔ اقبال نامہ ، مرتبہ : شیخ عطا اللہ ، جلد اول ، لاہور -
۴۔ انور اقبال ، بشیر احمد ڈار - لاہور ، ۱۹۷۷ء -
۵۔ ادرار الاحباب و فصوص الاداب (جلد دوم) ابو الفاختر یحییٰ باحرزی ، تہران ، ۱۳۴۵ -
۶۔ تاریخ تصوف ، پروفیسر یوسف سلیم چشتی ، لاہور ، ۱۹۷۶ء -
۷۔ تاریخ الفلسفہ العربیہ ، خلیل الجار و حناالفخری ، بیروت -
۸۔ تصوف اسلام ، عبدالماجد ، اعظم گڑھ ، ۱۹۴۷ء -
۹۔ تفہیم القرآن ، (جلد اول) ابوالاعلی مودودی ، لاہور ، ۱۹۵۱ء -
۱۰۔ (مجلہ) جوہر - اقبال نمبر - دہلی ، ۱۹۳۸ء -
۱۱۔ رسالہ القشیریہ ، ابوالقاسم ، عبدالکریم بن ہوازن القشیری ، بغداد -
۱۲۔ روزگار فقیر ، سید وحید الدین - جلد اول - لاہور -
۱۳۔ طبقات الصوفیہ ، خواجہ عبداللہ انصاری - کابل ، ۱۳۴۱ء -
۱۴۔ علامہ اقبال مرحوم ، پروفیسر یوسف سلیم چشتی ، لاہور ، ۱۹۷۷ء -
۱۵۔ کشف المحجوب ، سید علی ہجویری -
۱۶۔ کلیات اقبال (فارسی) ، لاہور ، ۱۹۷۳ء -
۱۷۔ کلیات اقبال (اردو) ، لاہور ، ۱۹۷۳ء -
۱۸۔ نفحات الانس ، عبدالرحمٰن جامی -
۱۹۔ مثنوی مولانا روم -
۲۰۔ ملفوظات اقبال ، محمود نظامی - لاہور ، ۱۹۴۹ء -
21. Siddiqi, Mazhar-ud-Din, Concept of Muslim Culture in Iqbal ; Lahore 1970.
22. Schimmel, Annemarie, Gabriel's Wing : Leiden, 1963.
23. Iqbal, Sir Muhammad, The Reconstruction of Religion Thought in Islam ; London, 1934.

اقبال کی ہنگامی شاعری

زیرِ نظر مضمون میں اس اہم اور دلچسپ بات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ ایک بڑے شاعر کی بھی چیزیں دیرپا نہیں ہوتیں اور بعض کی دلچسپی صرف تھوڑی دیر تک قائم رہتی ہے۔ عام زبان میں کہا جا سکتا ہے کہ ایک بہت اچھے شاعر کا بھی سارا کلام بہت اچھا نہیں ہوتا۔ اس سے کسی کو انکار نہیں اور ہمارے قومی شاعر اقبال پر بھی یہ بات عائد ہوتی ہے۔ اس سے اقبال کی عظمت کم نہیں ہوتی۔ بڑے سے بڑے مفکر کے بحرِ انکار میں بھی مختلف اوقات میں طوفان اور سکون اور بڑی چھوٹی لہریں ہوتی ہیں اور کیوں نہ ہوں ؟ ۔ ۔ ۔ اس اونچ نیچ کا اعتراف کرنے کے لیے ساتھ ہی ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ ایک بالغ نظر شخص کے نزدیک ''عارضی اور وقتی اہمیت'' ہمیشہ محض وقتی اور ہنگامی نہیں ہوتی۔ اقبال ''ہنگامی واقعات'' سے ضرور متاثر ہوا ، اس نے وقتی ضروریات کو پہچانا اور خوب پہچانا ، وہ صرف ''دائمی'' اقدار کا ایک نقاش نہ تھا بلکہ اس نے اپنی قوم اور نوعِ انسان کو مغربی تہذیب کی بعض بنیادی کمزوریوں سے آگاہ کیا جس کے زہریلے اثرات روزمرہ زندگی کے مختلف شعبوں میں سرایت کر رہے تھے۔ اس کا طریقِ اظہار کہیں شاعرانہ ، کہیں فلسفیانہ ، کہیں طنزیہ اور مزاحیہ ہے ، اس کی شاعری کہیں انتہا درجہ مؤثر ہے اور کہیں ذرا خشک۔ آپ کیسے توقع کر سکتے ہیں کہ ایک شاعر پر ہمیشہ ''ایک خاص کیفیتِ رقت طاری رہے۔ پھر اگر ہم کسی روز فرنگی کی محتاجی سے بے نیاز'' بھی ہو گئے تو کوئی وجہ نہیں کہ فرنگی کے متعلق اقبال کے تمام یا اکثر اشعار پھیکے پڑ جائیں۔ ان اشعار کی صرف ''ادبی'' حیثیت نہیں ، ان کی تاریخی و معاشری حیثیت بھی قائم رہے گی بشرطیکہ ان میں صحیح قسم کی ''ادبی'' خوبی موجود ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو اکبر الہ آبادی کا سارا کلام ہی بیکار ہو جائے۔ پھر اگر اقبال اور

پاکستانی ''فرنگی ، پتلون اور صوفے'' استعمال کرنے پر مجبور ہونے اور ساتھ ہی اقبال نے ''فرنگی ثقافت'' کے خلاف احتجاج کیا تو اس سے اس کا اظہار و احتجاج ''تاثیر'' سے خالی نہیں ہو جاتا ۔ اقبال نے نیک نیتی سے اپنے مشاہدہ اور تجربہ کو بیان کیا اور بزورِ بیان کیا ۔ اپنے مقالات میں بعض جگہ اقبال نے مغربی تہذیب کے علم و فنون کو سراہا بھی ہے لیکن نظم میں جو پیغام قوم کے نام دیا ہے اس میں یہ دیکھ کر کہ مغربی تمدن میں ''سود ایک کا لاکھوں کے لیے مرگِ مفاجات'' ہے اور ''یہ علم یہ حکمت یہ تدبر یہ حکومت'' ''پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیمِ مساوات'' وہ کیسے نہ کہتا کہ ''احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات'' اور ''علمِ حاضر سے ہے دیں زار و زبوں'' ! خرد مندوں کے لیے اس سے ''تحصیل علوم کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند'' نہیں ہو سکتا ۔ پھر ''مدرسہ'' اور ''اہلِ مدرسہ'' اور ''شیخ مکتب'' سے ''کشادہ دل'' نہ ہونے پر خیالات کو ''بے ربط و نظام'' پانا نہ محض کوئی ہنگامی کیفیت ہے اور نہ کوئی ''پھیکا'' اظہارِ خیال ۔ قول و فعل کا یہ تضاد ایک ''دائمی'' موضوعِ گفتگو ہے ۔ اقبال نے خود باوجود فلسفی و ادیب ہونے کے اگر ادب و فلسفہ کی ہر جگہ تعریف نہ کی بلکہ بتایا کہ ''اسبابِ ہنر کے لیے لازم ہے تگ و دو'' تو اس سے اس کا مقصود ادب و فلسفہ کو گرانا نہ تھا بلکہ محض اپنی ''ادب اور فلسفہ'' پسند بے عمل قوم کو راہِ عمل دکھانا تھا ۔ مقالہ نگار چاہتے ہیں کہ ''فرنگی سے آزادی'' کے وہ ایسے اشعار نہ پڑھیں ۔ ''عیدِ آزاداں شکوہ ملک و دیں ۔ عیدِ محکوماں ہجومِ مومنیں''۔ کیا وہ سمجھتے ہیں کہ ''فرنگی سے آزادی'' کے بعد اصلی آزادی اتنی جلدی مل جائے گی ؟ کیا وہ سمجھتے ہیں کہ بظاہر آزاد اقوام و افراد دراصل پورے طور پر آزاد ہو جاتے ہیں ؟ یاد رہے کہ اقبال کی آزادی و محکومی میں مادی و ذہنی و تمدنی و اخلاقی آزادی اور غلامی سب شامل ہیں ۔ یہ محض ''ہنگامی'' آزادی و محکومی نہیں ۔ علاوہ بریں ''فریاد ز افرنگ و دل آویزیٔ افرنگ'' کی فریاد صرف وقتی پکار نہیں ، اس کی گونج مدتوں تک سنائی دیتی رہے گی نہ وہ جلد بے اثر ہوگی اور ''پھیکی'' پڑے گی ۔ دراصل اس قسم کی کشمکش نوعِ انسان میں ہمیشہ جاری رہتی ہے اس کی شکل صورت بدلتی رہتی ہے یعنی :

دورِ حاضر ہے حقیقت میں وہی عہدِ قدیم
اہلِ سجادہ ہیں یا اہلِ سیاست ہیں امام

اگر سرمایہ داری کے خلاف تمام اشعار صرف ہنگامی شاعری میں شامل کیے جا سکتے ہیں تو بلاشبہ ہنگامی شاعری کے بعض نادر نمونے بڑے دیرپا اور "دائمی" دلچسپی کے حامل ثابت ہوں گے :

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعل ناب
از جفائے دیہخدایاں کشتِ دھقاناں خراب

کیا کوئی نقاد کہہ سکتا ہے کہ ایسے اشعار سے وہ لوگ محظوظ نہیں ہوتے جن کے ملکوں میں سرمایہ داری نظام جاری نہیں ؟ بلکہ حقیقت اس کے برعکس ہے ۔ کیا ترجمانِ حقیقت کو وقت کے ان خطرات سے اپنی قوم کو بآوازِ بلند آگاہ نہ کر دینا چاہیے تھا ؟ ایسی "ہنگامی شاعری" بعض دفعہ "دوامی شاعری" سے زیادہ مفید ، زیادہ جاندار اور زیادہ مؤثر ثابت ہوتی ہے ! ہاں یہ تسلیم ہے کہ "ہنگامی شاعری" کے بعض نمونے پھیکے ہوتے ہیں لیکن پھر "دوامی شاعری" کے نمونے اتنے پھیکے ہوتے ہیں کہ اُن پر شاعری کا نام بھی مشکل ہی سے عائد ہوتا ہے اور یہ بھی تسلیم ہے کہ ہر بڑے شاعر کی طرح اقبال کا کلام بھی اپنے نشیب و فراز رکھتا ہے اور ہمیں اپنی اکابر پرستی کی دھن میں اس حقیقت کو بھول نہ جانا چاہیے !! (ب ۔ ل)

شہرت اور مقبولیت کے لحاظ سے اقبال اپنے معاصرین میں سے ملک کا سب سے بڑا شاعر گزرا ہے ۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے کوئی جھٹلا نہیں سکتا ۔ اُس کے معاصرین نے بھی اُس کی مسلمہ عظمت سے کبھی انکار نہیں کیا ۔ یہ وضاحت اس لیے ضروری سمجھی گئی تا کہ آگے چل کر مقصدِ مضمون کے متعلق کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو ۔ لگے ہاتھوں ہنگامی شاعری کی تعریف بھی سن لیجیے تا کہ مضمون نگار کو مضمون سے اور نقاد کو مضمون نگار سے انصاف کرنے کا موقعہ ملے ۔ ہنگامی شاعری سے میری مراد شاعر کا وہ کلام ہے جو کسی آنی جذبے کے ماتحت کسی ایسے موضوع کے متعلق لکھا گیا ہو جس میں کچھ لوگ ایک محدود عرصے کے لیے دلچسپی لے رہے ہوں ۔ یہ کلام ادبی اوصاف کے لحاظ سے معیاری ہوتا ہے لیکن اس میں ہمہ گیری ہوتی ہے نہ دوام لیکن مقصدیت بدرجہ اتم اور کبھی کبھی خفیف انداز میں موجود ہوتی ہے ۔ یہ شاعری صداقتوں کا بھی آئینہ ہوتی ہے لیکن ایسی صداقتیں جن کی اپیل

ہنگامی ہوتی ہے ۔ تاریخ ادب میں اس شاعری کا مستقل مقام اور مرتبہ ہوتا ہے لیکن اسے قبولِ عام اور شہرتِ دوام نصیب نہیں ہوتی کیوں کہ اس کے مہیجات ہنگامی ، آنی ، قبائلی اور مقامی ہوتے ہیں ۔ سر عبدالقادر مرحوم نے اقبال کے متعلق لکھا ہے ۔

''شعر کہنے کی طرف جس وقت مائل ہوتے تو غضب کی آمد ہوتی تھی ۔ ایک ایک نشست میں بے شمار شعر ہو جاتے تھے ۔ ان کے دوست اور بعض طالب علم جو پاس ہوتے پنسل کاغذ لے کر لکھتے جاتے اور وہ اپنی دھن میں کہتے جاتے ۔ میں نے اس زمانہ میں انھیں کبھی کاغذ قلم لے کر فکرِ سخن کرتے نہیں دیکھا ۔ موزوں الفاظ کا ایک دریا بہتا یا ایک چشمہ اُبلتا معلوم ہوتا تھا ۔ ایک خاص کیفیت رقت کی عموماً اُن پر طاری ہوتی تھی ۔ اپنے اشعار سریلی آواز میں ترنم سے پڑھتے تھے ۔ خود وجد کرتے اور دوسروں کو وجد میں لاتے تھے ''۔[1]

اب ان اشعار کو سنیے :

آٹھا[2] کر پھینک دو باہر گلی میں
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے
الکشن ، ممبری ، کونسل ، صدارت
بنائے خوب آزادی نے پھندے
میاں نجار بھی چھیلے گئے ساتھ
نہایت تیز ہیں یورپ کے رندے

وہ[3] مس بولی ارادہ خودکشی کا جب کیا میں نے
مہذب ہے تو اے عاشق ! قدم باہر نہ رکھ حد سے
نہ جرأت ہے نہ خنجر ہے تو قصدِ خودکشی کیسا؟
یہ مانا دردِ ناکامی گیا تیرا گزر حد سے

---

۱ ۔ دیباچۂ بانگِ درا (اشاعت دوم) ، ص ۶ - ۷ -
۲ ۔ بانگِ درا (اشاعت دوم) ، ص ۳۳۵ -
۳ ۔ بانگ درا ، ص ۳۲۹ -

کہا میں نے کہ ''اے جانِ جہاں کچھ نقد دلوا دو
کرائے پر منگا لوں گا کوئی افغان سرحد سے

اب شیخ صاحب کی تقریظ پر غور فرمائیے کہ وہ کہاں تک ان اشعار پر منطبق ہوتی ہے۔ ان اشعار میں آمد اور الفاظ کی موزونیت تسلیم لیکن یہ کہ ان اشعار کو نظم کرتے ہوئے ایک خاص کیفیت وقت کی علامہ مرحوم پر طاری ہوتی تھی اور اشعار پڑھ کر وہ خود وجد کرنے لگتے تھے اور دوسروں کو وجد میں لاتے تھے، یہ ماننا ذرا مشکل ہے کیوں کہ اگر اسے تسلیم کر لیا جائے تو اقبال کے نفسیاتی تاثرات کے لیے کوئی نیا لفظ ایجاد کرنا پڑے گا۔ بہرصورت کہنا یہ مقصود ہے کہ سر عبدالقادر کے ارشادات اقبال کی دوامی شاعری کے لیے تو حرف بحرف صحیح ہیں اور اُن کی شعر گوئی اور شعر خوانی کی جن کیفیتوں کو شیخ صاحب مرحوم نے بیان کیا ہے وہ ایسی شاعری کے لوازم میں سے ہیں لیکن ہنگامی شاعری کی یہ تعریف نہیں ہو سکتی اور نہ ہنگامی شاعری اس معیار پر پوری اُترتی ہے۔ اقبال کے محولا بالا مذاحیہ اشعار اس مقصدیت کے تو حامل ہیں کہ ان میں مغربی تہذیب اور اس تہذیب کا پیدا کیا ہوا جن موردِ طعن و تشنیع بنایا گیا ہے لیکن یہ مقصدیت صرف اُسی فضا، اُسی زمانے اور انہی لوگوں تک محدود اور ان کی نظر میں قابلِ صد ستائش ہے جو مغربی تہذیب اور اس کے اثرات سے متنفر ہیں۔ مرورِ زمانہ سے مغربی تہذیب جن حلقوں میں مقبول ہو چکی ہے، وہ ان اشعار کی داد اس لیے نہیں دیں گے کیوں کہ یہ اُن کی ثقافت رواں پر ایک کھلا ہوا حملہ ہے۔ یہ بہت ممکن ہے کہ اُن کے آبا و اجداد یا ان کے قرب و جوار میں بسنے والے لوگ ابھی تک مغربی تہذیب اور اس کی ترویج کے مخالف ہوں اور وہ ان اشعار کی قدر کرتے رہے ہوں یا ابھی کچھ دیر اور کرتے رہیں لیکن ایک بات یقینی ہے کہ ان اشعار کو ہر مقام، ہر زمانے اور ہر ماحول کا وہ دوام حاصل نہیں جو ایسے اشعار کو ہے:

شیشۂ دہر میں مانندِ مئے ناب ہے عشق
روح خورشید ہے، خونِ رگِ مہتاب ہے عشق[1]

۱۔ بانگِ درا، ص ۱۲۳۔

کاہ مری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود
کاہ اُلجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں[1]

عطار ہو روسی ہو رازی ہو غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی[2]

جنوں نہ داری و ہوئے فگندۂ در شہر
سبو شکستی و بزمِ شبانہ می خواہی[3]

ان اشعار میں اس قسم کی ہمہ گیری ہے کہ یہ ہر زمان و مکان کے حقائق کی آئینہ داری کرتے رہیں گے۔ ان میں اس قسم کی صداقتیں بیان کی گئی ہیں جو ہر قوم اور ہر ملک کے لوگوں کے لیے زندۂ جاوید حقیقت رہیں گی، لیکن اب ذرا ان اشعار کو ملاحظہ فرمائیے۔

ہم مشرق کے مسکینوں کا دل مغرب میں جا اٹکا ہے
واں کنٹر سب بلوری ہیں یاں ایک پرانا مٹکا ہے[4]

روشِ مغربی ہے مدِ نظر وضعِ مشرق کو جانتے ہیں گناہ[5]

ہوا اس طرح فاش رازِ فرنگ کہ حیرت میں ہے شیشہ بازِ فرنگ[6]

تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ امومت
ہے حضرتِ انساں کے لیے اس کا ثمر موت[7]

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب
کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف[8]

یہ اور اس قسم کے اشعار میں اقبال نے فرنگ اور اہلِ فرنگ پر آوازے کسے ہیں۔ اقبال اس دور کی پیداوار تھا جب فرنگ اور

---

۱ - بالِ جبریل، ص ۶ -
۲ - بالِ جبریل، ص ۸۳ -
۳ - زبورِ عجم، ص ۹۱ -
۴ - بانگ درا، ص ۳۲۸ -
۵ - بانگ درا، ص ۳۲۵ -
۶ - بال جبریل، ص ۱۶۷ -
۷ - ضربِ کلیم، ص ۹۵ -
۸ - ضربِ کلیم، ص ۶۹ -

اہل فرنگ ثقافتی دنیا میں سیلاب کی طرح بڑھتے ہوئے آ رہے تھے ۔ اپنی ثقافت کی عظمت و افادیت پر ایمان رکھنے والے ہر انسان کی طرح بالکل قدرتی طور پر اقبال اس سیلاب سے خائف تھے اور اس کے مضر اثرات کے خلاف لوگوں کو آکسانے کا ایک طریقہ انھوں نے یہ بھی اختیار کیا کہ اس پر آوازے کسے لیکن تضحیک کے اس جذبے کی تہ میں ایک اور جذبہ بھی تھا اور وہ یہ تھا کہ اقبال فرنگ کے سیاسی غلام تھے اور اس غلامی سے متنفر ہونے کے باوجود وہ فرنگ کا تختہ نہیں الٹ سکتے تھے ۔ اس کا لازمی رد عمل یہ تھا کہ وہ ایک ماہر فن کار کی طرح ہر فرنگی چیز کے خلاف جہاد کرتے تھے اور اسی تاثر کے نتیجے کے طور پر مندرجہ بالا اشعار نظم کیے گئے ہیں ۔ تلاش کرنے پر اس قسم کے اور بھی بہت سے اشعار مل جائیں گے ۔ مجھے یہاں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اب جب کہ فرنگی سیاسی طور پر اس ملک سے رخصت ہو چکا ہے اور پاکستان میں کم از کم سرکاری طور پر فرنگی کا اقتدار ختم ہو چکا ہے ، ایسے اشعار کا مطالعہ اب کچھ لطف نہیں دیتا ۔ اگر ہمارے نا خدایان سیاست کی فراست و تدبر اور ہمارے عزائم کی بار آوری کی بدولت خدا نے وہ دن دکھایا کہ فرنگی کی طرح کی محتاجی سے بے نیاز ہو گئے تو یہ اشعار بالکل پھیکے پڑ جائیں گے ۔ یہ اشعار فرنگی تہذیب کی آمد آمد اور فرنگی کے سیاسی اقتدار کے عروج کے وقت فرنگی مدنیت کے خلاف تیرونشتر کی صورت میں چلائے گئے تھے ۔ یہ ہر اس مظلوم دل کی آواز تھے جس کو فرنگی استبداد نے اپنے پاؤں تلے روند ڈالا تھا لیکن سیاسی بساط کے الٹنے کے ساتھ ہدف ملامت ہی نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے تو اب ان اشعار کی ادبی حیثیت کے سوا اور کیا قیمت رہ جاتی ہے ؟ میرے اور آپ کے وہ بچے جو شاید فرنگی کو دیکھ بھی نہ سکیں ان اشعار کو پڑھ کر کیا تاثر محسوس کریں گے ؟ وہی فرنگی تہذیب تو اس کو پاکستانیوں نے اقبال مرحوم سمیت اپنی تہذیب کے ساتھ ملاکر اس کے خد و خال کچھ اس قسم کے تراشے ہیں کہ ایک ہی آدمی مختلف اوقات میں تہ بند بھی باندھتا ہے اور حسب ضرورت پتلون بھی پہنتا ہے وہ ریوڑی سے لے کر گنڈیری بھی کھاتا ہے اور میٹرو میں بیٹھ کر کیک پیسٹری بھی اڑاتا ہے ۔ جیسے کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے اقبال مرحوم خود سارا دن چارپائی پر بیٹھے رہتے تھے لیکن ان کے گول کمرے میں افرنگی صوفے اور ایرانی قالین

موجود تھے ۔ دنیا کے ذرائع آمد و رفت اور حمل و نقل کے اسباب کی فراوانی کے ساتھ ساتھ مختلف ثقافتوں کے ظاہری اسباب اور ڈیل ڈول کے متعلق حد فاصل معین کرنا دن بدن اور بھی مشکل ہوتا جاتا جا رہا ہے۔ لہٰذا ان حالات میں اقبال کے وہ تمام ہنگامی اشعار جو فرنگی تہذیب و ثقافت کے خلاف لکھے گئے ہیں اب اس تاثیر سے خالی ہیں یا خالی ہو جائیں گے جو چند سال پہلے ان کا خاصہ تھی۔

اقبال کی ہنگامی شاعری میں دوسری صنف ان اشعار کی ہے جو اس نے غیر ملکی اور فرنگی علوم کے خلاف لکھے ۔ اس سلسلے میں علامہ مرحوم نے جہاں تک مادیت کی پرستش کے خلاف تبلیغ کی ہے وہ قابل صد ستایش ہے لیکن مغربی علوم اور ان کی تحصیل کو محض اس لیے قابل ملامت بنانا کہ وہ فرنگی کے آثار ہیں ، غلط ہوگا۔

چشم بینا سے ہے جاری جوئے خوں
علم حاضر سے ہے دیں زار و زبوں[1]

میں ''ہر چشم بینا'' نے کچھ اس قسم کی تعلی کی ہے اور ہر ''علم حاضر'' کو کچھ اس طرح ہدف ملامت بنایا ہے کہ داد دینے میں آدمی کچھ ہچکچاہٹ محسوس کرتا ہے ۔ یہ بات کسی ایک ''چشم بینا'' اور کسی ایک ''علم حاضر'' کے متعلق تو کہی جا سکتی ہے لیکن اگر ہر ''چشم بینا'' پر ''علم حاضر'' کو اس لاٹھی سے ہانکنے لگے تو تحصیل علوم کا دروازہ پاکستانیوں پر کم از کم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گا اور پاکستانی وہ علوم بھی نہیں سیکھ سکیں گے جن کی تحصیل سے یقینی طور پر شاعر ملت خود متمتع ہوا۔ یہ ماضی کا ذکر تھا ، اب اس حال اور مستقبل پر غور فرمائیے جس میں ہم چاہتے ہیں کہ اس قسم کے مکاتب خیال کی ترویج و اشاعت ہو کہ ان سے ہر فارغ التحصیل اسوہ حسنہ کا پیروکار ہو کر نکلے ۔ جب حالات کے سازگار ہونے سے ہم اس کوشش میں کامیاب ہو جائیں گے تو ان اشعار کا مفہوم ان حالات پر منطبق کرنا

---

۱ ۔ بال جبریل ، ۱۸۰ ۔

دشوار ہوگا کہ

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الہ الا اللہ[1]

شیخِ مکتب کے طریقوں سے کشادِ دل کہاں
کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ[2]

ہر ہے افکار سے ان مدرسہ والوں کا ضمیر
خوب و ناخوب کی اس دور میں ہے کس کو تمیز[3]

مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر
چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام[4]

پھر یہ بھی سنیے کہ علم ، ادب اور فلسفہ پر اقبال نے کس قدر بڑے بڑے پتھر پھینکے ہیں :

یہ مدرسہ یہ کھیل یہ غوغائے روا رو
اس عیشِ فراواں میں ہے ہر لحظہ غمِ نو
ناداں ! ادب و فلسفہ کچھ چیز نہیں ہے
اسبابِ ہنر کے لیے لازم ہے تگ و دو[5]

اب علامہ مرحوم کی مراد اگر یہ تھی کہ مسلمان عوام کو ٹیکنیکل تعلیم حاصل کرنی چاہیے تو بھی مدرسہ ، ادب و فلسفہ کو برا بتانے کے بغیر بھی یہ تبلیغ کی جا سکتی تھی اور پھر ادب و فلسفہ کے بغیر ایسے ''ہنر مند'' پیدا کرنا بھی کہاں تک ممکن ہے جو اچھے شہری بھی ہوں - اس وقت پھر اقبال کے سامنے صرف وہ مدرسے تھے جن میں صرف ''غوغائے روا رو'' ہے لیکن ایسے مدرسے والے یہ شعر اپنے دروازے پر لکھنے کے لیے تیار نہیں ہوں گے جو شعوری طور پر ہنر مند ادیب اور فلسفی پیدا کرنے کی سعی میں مصروف ہیں -

---

۱ - بال جبریل ، ص ۶۹ -
۲ - ضرب کلیم ، ص ۷۸ -
۳ - ضرب کلیم ، ص ۸۰ -
۴ - ضرب کلیم ، ص ۸۱ -
۵ - ضرب کلیم ، ص ۱۶۹ -

اقبال کی شاعری میں تیسری صنف آن ہنگامی اشعار کی ہے جو انگریز کی غلامی کے خلاف لکھے گئے ہیں ۔ ان اشعار کا ایک کثیر مجموعہ اردو اور فارسی کلام میں موجود ہے ۔ انگریز کی حکومت کے زمانے میں یہ شعر ہر آزادی خواہ کو بہت بھاتے تھے اور ولولہ انگیز جذبات کو مہیج کرتے تھے ۔ ہر غلام اور غلام زادہ ان اشعار کو پڑھ کر یہ تسکین محسوس کرتا تھا کہ اقبال نے استبداد فرنگ کا قصاص معنوی طور پر لے لیا ہے ۔ وہ اپنے آپ کو انگریز ''شاہین'' کے سامنے ''مرغ در چنگ'' سمجھتا ہوا کبھی ان اشعار کو پڑھ کر مظلوم دل کے لیے سہارا ڈھونڈھ لیتا تھا اور کبھی ''نشہ درویشی'' میں اس امید سے مگن رہتا تھا کہ کبھی تو ''تخت جمشید'' ہاتھ لگ ہی جائے گا لیکن غلامی کا دور گزر جانے کے بعد اب ان اشعار کی قیمت آپ کس طرح معین کریں گے :

تا[3] غلامم در غلامی زاده ام	ز آستان کعبه دور افتاده ام
ما غلاماں از جلالش بی خبر	از جمال لا زوالش بی خبر
از غلامی لذت ایماں مجو	گرچہ باشد حافظ قرآں مجو
عید آزادان شکوه ملک و دیں	عید محکوماں ہجوم مومنیں

فرنگ سے آزادی کے باوجود اگر مسلمان ان مصائب سے نجات نہیں پاسکا تو اب ایسے اشعار کہنے کا موقع نہیں رہا ورنہ منطقی طور پر دلیل و نتیجہ میں کوئی ربط قائم نہیں رہتا ۔ اس طرح کے کچھ اور شعر سنیے جن میں اس وقت کی سیاسی غلامی کے زیر اثر اقبال نے فرنگی سے اظہار نفرت کیا ہے لیکن اب جب کہ نہ فرنگی سامنے ہے نہ فرنگی اقتدار اور نہ ہم اس سے کسب فیض کرتے ہیں ، ان اشعار کا کیا مقام رہ گیا ہے:

اگر قبول کرے دین مصطفیٰ انگریز
سیاہ روز مسلماں رہے گا پھر بھی غلام[4]

---

۱ - ترا ناداں امید غمگساری ہا ز افرنگ است
دل شاہیں نسوزد بہر آں مرغے کہ در چنگ است ، زبور عجم ، ص ۱۸۲
۲ - بانشہ درویشی در ساز و دما دم زن
چوں پختہ شوی خود را بہ سلطنت جم زن ، زبور عجم ، ص ۱۰۶ -
۳ - پس چہ باید کرد ای اقوام شرق ، ص ۹۵ م -
۴ - ضرب کلیم ، ص ۶۰ -

کہنہ شدہ افرنگ را آئین و دین
سوی آں دیر کہن دیگر مبین[1]

مقصد[2] ہے ملوکیت انگلیس کا کچھ اور
قصہ نہیں تاریخ کا یا شہد و رطب کا
فرنگ[3] آئین جمہوری نہاد است
رسن از گردنِ دیوی کشاد است
فریاد[4] از افرنگ و دلآویزی افرنگ
فریاد ز شیرینیٔ پرویزیٔ افرنگ
عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزیٔ افرنگ

اقبال کا ایک اور مقبول ہنگامی موضوع پیشواؤں ، سیاسی لیڈروں ، خواجاؤں اور پیروں کے خلاف شعر لکھنا رہا ہے - یہ موضوع ابھی تک کسی حد تک جاندار ہے کیونکہ ابھی تک پاکستان میں ان اقتدار گیر قوتوں کا قلع قمع نہیں ہوا اور ہم ابھی تک

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی
گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن[5]
شہری ہو دہاتی ہو مسلمان ہے سادہ
مانند بتاں پجتے ہیں کعبے کے برہمن
تدرالہ نہیں سود ہے پیرانِ حرم کا
ہر فرقۂ مالوس کے اندر ہے مہاجن

دورِ حاضر[6] ہے حقیقت میں وہی عہد قدیم
اہلِ سجادہ ہیں یا اہلِ سیاست ہیں امام

---

۱ - جاوید نامہ ، ص ۸۸ -
۲ - ضرب کلیم ، ص ۱۵۹ -
۳ - زبورِ عجم ، ص ۲۳۳ -
۴ - زبورِ عجم ، ص ۱۱۸ -
۵ - بال جبریل ، ص ۲۰۰-۲۱۹ -
۶ - ضربِ کلیم ، ص ۱۴۵ -

خواجہ[1] از خونِ رگ مزدور سازد لعل ناب
از جفائے دہ خدایان کشت دہقاناں خراب

آمید[2] کیا ہے سیاست کے پیشواؤں سے
یہ خاکباز ہیں رکھتے ہیں خاک سے پیوند

مریدی[3] فاقہ مستی گفت با شیخ
کہ یزداں را ز حالِ ما خبر نیست
بہ ما نزدیک تر از شہ رگِ ماست
و لیکن از شکم نزدیک تر نیست

یہ شعر پڑھ کر لطف اندوز ہوتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ یہ ہمارے حسب حال ہیں لیکن جن ملکوں یا قوموں میں سیاست، مذہب اور سرمایہ داری کے یہ نظام رائج نہیں وہ ان اشعار سے محظوظ نہیں ہو سکتے اور میں اس لیے اس قبیل کے اشعار کو بھی ہنگامی شاعری میں شامل کرتا ہوں۔

اس مضمون کے اختتام پر یہ امر پھر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ہنگامی شاعری کا ادبی مرتبہ شاعری کی کسی اور صنف سے کسی طرح کم نہیں، صرف اس کا دائرۂ عمل وقتی اور محدود ہے۔

٭ ٭ ٭

---

۱ - زبور عجم، ص ۱۴۴ -
۲ - ضرب کلیم ص ۱۹۰ -
۳ - ارمغان حجاز، ص ۴۰ -

اقبال اور معاشرہ

انسانی معاشرے کے اتنے مختلف رخ اور اضلاع ہیں کہ جب تک کوئی آدمی ریفارمر کا منصب اختیار کر کے اس کو اپنا مقصود اور ہدف نہیں بنا لیتا ، اس وقت تک اس کے لیے ان تمام اضلاع کا احاطہ کرنا ناممکن ہوتا ہے ۔ حکیم مشرق حضرت علامہ اقبال نے اپنے لیے صرف ''مفکر'' کا منصب منتخب کیا اور اس انتخاب میں انھیں اس قدر کامیابی ہوئی کہ آج بلاخوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس صدی میں اسلامی دنیا کے مفکرِ اعظم تھے ۔ ظاہر ہے کہ ایک کامیاب اسلامی مفکر کی نظر صرف مسلمانوں کے معاشرے تک محدود نہ رہ سکتی تھی ۔ ان کے سامنے ہندی مسلمان کے جملہ حل طلب مسائل کے علاوہ اسلامیانِ عالم کے مسائل بھی موجود تھے اور آنھوں نے اپنی بساط اور امتدادِ حیات کے مطابق ان مسائل پر غور کرنے اور ان کا حل تلاش اور تجویز کرنے کی مساعی کیں ۔ یہ مساعی کس حد تک کامیاب ہوئیں ، اس کا فیصلہ مستقبل کرے گا اور ان کے تجویز کردہ حل کس حد تک قابلِ قبول تھے یا ہیں ، اس کا فیصلہ ملتِ اسلامیہ کے ہاتھ میں ہے ۔

اقبال نے جن مسائل پر غور کیا ، ان میں سے ایک معاشرہ یا معاشرہ کے کچھ رخ تھے ۔ آنھوں نے اس مسئلہ کے متعلق اپنی تنقید اور وضاحت کے بعد حل یا اصلاح کی تجاویز بھی پیش کر دیں ۔ اس تنقید ، وضاحت ، حل اور اصلاح کی تجاویز سے آپ کو اتفاق ہو یا نہ ہو ، لیکن اس مقالے میں صرف یہ کوشش کی گئی ہے کہ معاشرہ کے متعلق اقبال کے نظریات آپ کی خدمت میں یک جا کر کے پیش کر دیے جائیں ۔

اسلام سے راہنمائی : سب سے پہلے یہ وضاحت کرنا لازمی معلوم ہوتا ہے کہ اقبال معاشرہ کے مسائل کو حل کرنے اور اس کی اصلاح کی تجاویز

پیش کرنے میں اپنے لیے اکثر اور بیشتر راہنمائی اسلام اور احکامِ اسلام میں تلاش کرتے رہے ہیں ۔ انھوں نے کچھ نئی اخلاقی اقدار اور سیاسی نظریات بھی وضع کیے ، لیکن عمومی حیثیت سے ان کے الہامات کا منبع اور سرچشمہ اسلام ہے اور ان بزرگانِ دین اور مفکرین کے کردار اور ملفوظات ہیں جنھوں نے ان سے پہلے عالمِ اسلام میں اپنے لیے ممتاز مقام پیدا کیا ۔ معاشرہ کا تار و پود وہ افراد ہیں جو ملت کی تعمیر کرتے ہیں اور ملت کی تہذیب و ترتیب کے لیے انھوں نے صرف "رموزِ بے خودی" میں جو عنوان قائم کیے ہیں ، ان میں سے چند ایک کے حصے ملاحظہ فرمائیے :

"ملتِ محمدیہ موسس بر توحید و رسالت است" (ص ۴۵) ۔

"آئینِ محمدیہ قرآن است" (ص ۵۸) ۔

پختگی سیرتِ ملت از اتباع آئین الٰہیہ است (ص ۶۵) ۔

حسن سیرتِ ملت از تادب بآداب محمدیہ است (ص ۷۱) وغیرہ وغیرہ ۔

گویا عقیدے کے لحاظ سے اقبال کے ہاں معاشرہ کا بنیادی تصور اسلام ہے ۔ اسی لیے مشہور مستشرق نکلسن نے "اسرارِ خودی" کے ترجمہ کا دیباچہ لکھتے ہوئے کہا :

"یہ فرض کرتے ہوئے کہ فرد کی مکمل نشو و نما کے لیے جماعت کی موجودگی لازم ہے ، اقبال مثالی جماعت اس سوسائٹی میں پاتے ہیں جس کو وہ حضرت محمدؐ کے تصور اسلام میں مضمر پاتے ہیں ۔"

اقبال کے یہاں اسی عقیدے پر جا بجا اصرار ملے گا ۔ مثلاً :

برگ و سازِ ما کتاب و حکمت است
این دو قوت اعتبار ملت است (مسافر ، ص ۴۰)

دارم اندر سینہ نورِ لا الٰہ !
در شرابِ من سرورِ لا الٰہ (مسافر ، ص ۴۴)

مردِ مومن را عزیز ، اے نکتہ رس
چیست جز قرآن و شمشیر و فرس ؟
(جاوید نامہ ، ص ۲۴۰)

قبائلیت کی مذمت : معاشرے کی عام ہیئت میں ''قبائلیت''، ''گروہ بندی''، ''افتخار نسب'' اور ''جغرافیائی حد بندی'' پر اقبال نے سب سے پہلے اور سب سے کڑی تنقید کی ہے۔ اس سلسلہ میں ان کا روئے سخن بیشتر ہندی مسلمان سے رہا ہے جو شاید جغرافیائی حد بندی کا تو اتنا قائل نہ تھا لیکن قبائلیت، گروہ بندی اور افتخار نسب کا عملی طور پر قائل تھا۔ اقبال نے معاشرہ کی اس ہیئتِ ترکیبی کی مذمت کی ہے :

بر نسب نازاں شدن نادانی است
حکمِ او اندر تن و تن فانی است
جوہر ما با مقامی بستہ نیست
بادۂ تندش بجامی بستہ نیست
ہندی و چینی سفالِ جامِ ماست
رومی و شامی گلِ اندامِ ماست
قلبِ ما از ہند و روم و شام نیست
مرز و بومِ او بجز اسلام نیست

خویشتن را ترک و افغاں خواندہ ای
وای بر تو آنچہ بودی ماندہ ای

قوم تو از رنگ و خوں بالا تر است
قیمت یک اسودش صد احمر است

نیست از روم و عرب پیوندِ ما
نیست پابندِ نسب پیوندِ ما

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم
چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیز رنگ و بو بر ما حرام است
کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم

ہنوز از بندِ آب و گل نہ رستی
تو گوئی رومی و افغانیم من
من اول آدمِ بی رنگ و بویم
ازاں پس ہندی و تورانیم من

اور پھر انگریزی میں فرمایا :

''میری فارسی منظومات کا مقصد اسلام کی وکالت نہیں ۔ درحقیقت میں ایک بہتر معاشری نظام کا متلاشی ہوں اور اس تلاش میں ایک ایسے نظام کو نظر انداز کرنا ناممکن ہے جو پہلے ہی سے موجود ہے اور جس کا مقصد نسل ، ذات اور رنگ کے امتیازات کو ملیا میٹ کرنا ہے ۔''

اس بیان سے جہاں ہمیں یہ پتا چلتا ہے کہ علامہ مرحوم کے دل میں اسلامی نظامِ حیات کے لیے بے حد احترام تھا ، وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس مفکرِ اعظم کی فارسی شاعری کا مطمح نظر فقط یہ تھا کہ اس معاشرے کی ترویج کی جائے جس میں نسل ، ذات اور رنگ کی تمیز نہ رہے :

امومت : اقبال نے امومت کو معاشرے کا سنگِ بنیاد ٹھہرایا ہے ، اس لیے ہم بھی سب سے پہلے معاشرے کے اس اہم ستون کی وہ حدود آپ کے سامنے پیش کریں گے جو علامہ مرحوم نے مقرر کی ہیں ۔ اقبال نے مشرق و مغرب کی سیاحت فرمائی تھی اور عورت کا بغور مطالعہ کیا ، اس لیے اُن کے ذہن میں معاشرے کے اس اہم رکن کے واضح نقوش موجود تھے اور اصولی طور پر وہ اس کے مداح تھے :

نغمہ خیز از زخمۂ زن ، سازِ مرد
از نیازِ او دوبالا نازِ مرد
پوشش عریانی مردان زن است
حسنِ دلجو عشق را پیراہن است
عشقِ حق پروردۂ آغوش او
ایں نوا از زخمۂ خاموش او

(رموزِ بیخودی ، ص ۱۴۹)

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں
مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں

مسلمان نے معاشرے میں عورت کو جو رتبہ دیا تھا ، انھیں اس پر اعتراض تھا :

مسلمے کو را پرستارے شمرد
بہرہ اے از حکمتِ قرآن نبرد

(رموز ، ص ۱۰۴)

جوہر مرد عیاں ہوتا ہے بےمنتِ غیر
غیر کے ہاتھ میں ہے جوہرِ عورت کی نمود
میں بھی مظلومیٔ نسواں سے ہوں غمناک بہت
نہیں ممکن مگر اس عقدۂ مشکل کی کشود

کیونکہ ان کا خیال تھا :

از اموست گرم رفتارِ حیات
از اموست کشفِ اسرارِ حیات
از اموست پیچ و تاب جوئے ما
موج و گرداب و حبابِ جوئے ما

لیکن ''نازک پیکر'' اور ''محشر بدوش'' عورت کی تعریف انھوں نے نہیں کی :

وان تہی آغوش نازک پیکرے
خانہ پرورد نگاہش محشرے
فکر او از تابِ مغرب روشن است
ظاہرش زن باطنِ او نازن است
بندہای ملتِ بیضا گسیخت
تا ز چشمش عشوہ ہا حل کردہ ریخت
شوخ چشم و فتنہ زا آزادیش
از حیا ناآشنا آزادیش
علم او بارِ اموست برنتافت
بر سر شامش یکی اختر نتافت
ایں گل از بستانِ ما نارستہ بہ
داغش از دامانِ ملت شستہ بہ

(رموزِ بیخودی ، ص ۱۵۰-۱۵۱)

میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ بہت ممکن ہے کہ اقبال کی تنقید سے آپ کو اتفاق نہ ہو لیکن اگر آپ گرد و پیش پر نظر دوڑائیں تو اسلامیوں کے معاشرے میں وہ عورت کبھی کبھی اور کہیں کہیں چلتی پھرتی نظر آئے گی جس کی تصویر اقبال نے کھینچی ہے ، اس لیے اقبال کے مشاہدہ کی آپ کو داد دینا پڑے گی - اسی طرح وہ عورت بھی نظر آئے گی جسے اقبال نے اموست کا معیار ٹھہرایا ہے :

این دُخترِ رستاق زادے جاہلے
پست بالائے ، سطبرے ، بدگلے
ناتراشے پرورش نادادۂ
کم نگاہے ، کم زبانے ، سادۂ
دل ز آلامِ اموست کردہ خوں
گرد چشمش حلقہہائے نیلگوں
ملت ار گیرد ز آغوشش بدست
یک مسلمانِ غیور و حق پرست
ہستیٔ ما محکم از آلامِ اوست
صبح ما عالم فروز از شامِ اوست
(رموزِ بیخودی ، ص ۱۵۰)

شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشتِ خاک اس کی
کہ ہر شرف ہے اسی دُرج کا درِ مکنوں

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کو عورت کی وہ بے راہروی پسند نہ تھی جو خالص فرنگی تہذیب یا معاشرے کے اثر کا نتیجہ تھی :

تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ امومت
ہے حضرتِ انساں کے لیے اس کا ثمر موت

تصور زن کا نہیں ہے کچھ اس خرابی میں
گواہ اس کی شرافت پہ ہیں مہ و پرویں

فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور
کہ مرد سادہ ہے بیچارہ زن شناس نہیں

اور زہر اور قند کی تمیز رکھتے ہوئے اقبال واضح لفظوں میں عورت کی

بے راہروی پر تنقید کرتے ہوئے ڈرتے بھی ہیں :

اس بحث کا کچھ فیصلہ میں کر نہیں سکتا
گو خوب سمجھتا ہوں کہ یہ زہر ہے یہ قند
کیا فائدہ کچھ کہہ کے بنوں اور بھی معتوب
پہلے ہی خفا مجھ سے ہیں تہذیب کے فرزند
اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش
مجبور ہیں ، معذور ہیں مردانِ خرد مند

اور فقط یہ نصیحت دے کر خاموش ہو جاتے ہیں :

اگر پندے ز درویشے پذیری
ہزار است بمیرد تو نہ میری
بتولیؓ باش و پنہاں شو ازیں عصر
کہ در آغوش ، شبیرے بگیری

(ارمغانِ حجاز ، ص ۱۳۳)

بہل ای دخترک ایں دلبریہا
مسلماں را نہ زیبد کافریہا
منہ دل بر جمال غازہ پرورد
بیاموز از نگہ غارتگریہا

(ارمغانِ حجاز ، ص ۱۳۰)

تعلیم و تعلم اور تربیت : عصر حاضر کے معاشرے میں تعلیم و تعلم اور تربیت کے سلسلوں کو بالعموم اقبال نے موردِ تنقید ٹھہرایا ہے اور ہندی مسلمان کو بالخصوص متنبہ کیا ہے کہ ان کے دبستانوں میں تعلیم و تربیت کے وسائل کا فقدان روز افزوں ترقی پر ہے :

سرچشمۂ زندگی ہوا خشک
باقی ہے کہاں مئے شبانہ ؟
خالی ان سے ہوا دبستاں
تھی جن کی نگاہ تازیانہ !

دنیا ہے روایات کے پھندوں میں گرفتار
کیا مدرسہ کیا مدرسہ والوں کی تگ و دو
کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت
وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو

مدرسہ کی ''خامکاری'' اور ''خوب و ناخوب'' کی تمیز سے بے تکلفی کی وجہ سے معاشرے میں جو قباحتیں پیدا ہوتی ہیں، اُن کا ذکر اقبال نے تفصیل سے کیا ہے اور علم کی ظاہری تحصیل سے وہ اس لیے مطمئن نظر نہیں آتے کہ اس عمل سے ملت کے لیے مفید انسانوں کی تعداد نہ صرف بڑھ نہیں رہی بلکہ کم ہوتی جا رہی ہے۔

اقبال کا طرزِ فکر یہ ہے کہ عصرِ حاضر کا معلم اور متعلم دونوں اپنی راہ سے ہٹ گئے ہیں اور مکاتب میں علم کا صحیح مقام متعین کرنے کی راہیں مسدود ہو چکی ہیں۔ اقبال نے شیخ مکتب کو ''عمارت گر روح انساں'' کا خطاب دیا ہے اور اسے قومی دولت یعنی ملت کے نونہالوں کے متعلق پرامید رہنے کا مشورہ دیا ہے لیکن اس شرط پر کہ وہ بھی اتنی بصیرت رکھتا ہو کہ یہ دیکھ سکے کہ قوم کے بچوں کا بھی زندگی میں کوئی ہدف یا مقصود ہے یا نہیں۔

''نگاہِ پاکباز'' اور ''دین و دانش'' کی تحصیل اقبال کے نظریۂ تربیت میں ایک دوسرے کے لوازم میں سے ہیں۔ اگر بیک وقت معاشرے میں ایسی تعلیم و تربیت کا انتظام نہیں ہو رہا تو اقبال کے عقیدہ کے مطابق یہ ساری کوشش رائیگاں جا رہی ہے۔ یہ نظریہ پیش کرنے میں اقبال نے تعلیم و تربیت کے مسلمہ اصول کو بیان کیا ہے۔ اس لیے ان کے اس نظریہ کو عالمگیر اور دوامی تائید حاصل ہے لیکن یہ امر فراموش نہ کرنا چاہیے کہ اس صدی میں اقبال پہلے مسلمان مفکر ہیں جنھوں نے عصرِ حاضر کے اسلامی ممالک کے مکاتب کی تعلیم و تربیت کے سرسری پن اور کھوکھلے پن کا مشاہدہ کر کے بڑی جرأت سے اس کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ اس سلسلے میں جب ہم یہ غور کرتے ہیں کہ اقبال خود بھی اسی معاشرہ کے پروردہ تھے جس کے وسائل تعلیم و تربیت میں وہ خامیاں موجود تھیں جن کا ذکر وہ بار بار کرتا ہے تو اقبال کی تبلیغ اور بھی

زیادہ پُرلطف اور دلچسپ معلوم ہونے لگتی ہے لیکن ہمیں پھر اس بات کی داد دینا پڑتی ہے کہ اقبال کے مشاہدہ اور مطالعہ نے اُن مصائب کو جمع کیا جو عام آدمیوں کی نظروں سے اوجھل رہے اور اس تنقید کو پھر حسبِ معمول اقبال نے یہ حل سمجھا کر ختم کیا ہے :

بہ پورِ خویش دین و دانش آموز
کہ تابد چوں مہ و انجم نگینش
بدستِ او اگر دادی ہنر را
یدِ بیضا ست اندر آستینش

رہنما اور قائدین : معاشرے میں سیاسی ، مذہبی اور اخلاقی رہنماؤں کے اخلاق اور کردار سے جو بددلی ، نفاق اور ہزیمت خوردگی پیدا ہوتی ہے اس کے مختلف پہلوؤں پر اقبال نے بڑی چابکدستی سے بحث کی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ اخلاقی اقدار کے انحطاط کی وجہ سے قائدین ، ملت کو منزلِ مقصود پر پہنچانے سے قاصر رہے ہیں - ہم یہاں رہنماؤں کی اُن مختلف اقسام کا جائزہ لیں گے جن کو اقبال زیرِ بحث لایا ہے - سب سے پہلے سیاسی رہنماؤں کو لیجیے ، پھر سیاست کی تعریف سنیے :

اس کھیل میں تعین مراتب ہے ضروری
شاطر کی عنایت سے تو فرزیں ، میں پیادہ
ہے چارہ پیادہ تو ہے اک مہرۂ ناچیز
فرزیں سے بھی پوشیدہ ہے شاطر کا ارادہ

عصرِ حاضر کے سیاست مداروں کی شعبدہ بازی اور طلسم کاری کا افسانہ اقبال نے اس طرح بیان کیا ہے :

داغم از رسوائی ایں کارواں
در امیرِ او ندیدم نورِ جاں
تن پرست و جاہ مست و کم نگہ
اندرونش بے نصیب از لا الہ
در حرم زاد و کلیسا را مرید
پردۂ ناموس ما را بر درید

دامنِ او را گرفتن ابلہی است
سینۂ او از دلِ روشن تہی است
(پس چہ باید کرد ، ص ۳۶)

سیاست مدار کی کلیسا پرستی اور اسلامی نظامِ حیات سے بُعد کی وجہ سے اس کی لادینی پر اقبال نے کڑی تنقید کی ہے۔

سیاسی قائدین کے علاوہ غلط قسم کے مذہبی رہنماؤں اور پیروں نے معاشرے میں جو فساد برپا کیا ہوا ہے ، اس کا بھی اقبال نے گہرا مطالعہ کیا ۔ مذہب کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اور اس کی ترویج و اشاعت پر مصر ہوتے ہوئے بھی غلط کار مذہبی رہنما کا ایک نمونہ اقبال نے تلاش کیا جسے وہ ''مُلا'' کے نام سے پکارتا ہے ۔ معاشرے میں اس رہنما کے کارناموں ، اس کی فطرت اور اس کے اخلاق پر تبصرہ کرتے ہوئے کبھی مذاحاً اور کبھی متانت سے بہت سی دلچسپ باتیں کہی ہیں :

میں بھی حاضر تھا وہاں ضبطِ سخن کر نہ سکا
حق سے جب حضرتِ مُلا کو ملا حکمِ بہشت
عرض کی میں نے الٰہی مری تقصیر معاف
خوش نہ آئیں گے اسے حور و شراب و لبِ کشت
نہیں فردوس مقامِ جدل و قال و اقول
بحث و تکرار ہے اس اللہ کے بندے کی سرشت
ہے بد آموزیٔ اقوام و ملل کام اس کا
اور جنت میں نہ مسجد نہ کلیسا نہ کنشت

عجب نہیں کہ خدا تک تری رسائی ہو
تری نگہ سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام
تری نماز میں باقی جلال ہے نہ جمال
تری اذاں میں نہیں ہے مری سحر کا پیام

قوم کیا چیز ہے ، قوموں کی امامت کیا ہے ؟
اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

مُلا کی متابعت سے انسان کا جو حشر ہوا ہے ، اس کی تفصیل سن لیجیے:

آسیا آں مرزوبوم آفتاب
غیر بیں ، از خویشتن اندر حجاب

قلب او بہ واردات نو بنو
حاصلش را کس نگیرد با دو جو
روزگارش اندریں دیرینہ دیر
ساکن و یخ بستہ و بے ذوقِ سیر
صیدِ ملایان و نخچیر ملوک
آہوئے اندیشہ او لنگ و لوک

اسی لیے اقبال نے مُلا کے فتووں کی قیمت گھٹاتے ہوئے کہا :

مُنکرِ حق نزد مُلا کافر است
مُنکر خود نزد من کافر تر است

پیروں کی نخچیر گیری کا ذکر اقبال نے مزے لے لے کر کیا ہے اور بالخصوص پنجابی مسلمان کو اس کا ہدفِ ملامت بنایا ہے۔ خانقاہوں کے مجاوروں اور پیروں کی کم نگہی اور کھوکھلے پن کا قصہ ''پنجاب کے پیر زادوں سے'' کے عنوان سے ایک قطعہ میں بیان کیا ہے، جس میں حضرتِ علامہ کو شیخ مجددؒ کے مزار پُرانوار سے ایک التجا کا جواب یہ ملتا ہے :

آئی یہ صدا ''سلسلہ فقر ہوا بند
ہیں اہلِ نظر کشورِ پنجاب سے بیزار
عارف کا ٹھکانا نہیں وہ خطہ کہ جس میں
پیدا کلہِ فقر سے ہو طرۂ دستار
باقی کلہِ فقر سے تھا ولولہ حق
طروں نے چڑھایا نشہ خدمت سرکار''

اسی لیے اقبال نے کہا :

قم باذن اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

اب فقط وہ لوگ رہ گئے جنھوں نے ملت کو ان مسائل میں اُلجھا دیا کہ

ابنِ مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے ؟
ہیں صفاتِ ذاتِ حق ، حق سے جدا یا عینِ ذات ؟

آنے والے سے مسیح ناصری مقصود ہے
یا مجدد جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات ؟
ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم
اُمتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات ؟

سرمایہ داری کی مذمت : معاشرے کی اصلاح کے لیے اقبال نے جہاں اس کے اور کئی معیوب پہلوؤں پر روشنی ڈال کر بہتری کی تجاویز پیش کیں ، وہاں انھوں نے سرمایہ داری کو معاشرے کے لیے سمِ قاتل قرار دے کر اس کی بہت مذمت کی :

پوجا بھی ہے بے سود نمازیں بھی ہیں بے سود
قسمت ہے غریبوں کی وہی نالہ و فریاد
ہیں گرچہ بلندی میں عمارات فلک بوس
ہر شہر حقیقت میں ہے ویرانہ آباد

''ویرانہ آباد'' کو بسانے والوں کی زندگی کی تفاصیل بیان کر کے جب اقبال پُرجوش انداز میں اس کی حمایت میں نعرہ زن ہوتے ہیں تو بسا اوقات یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ آج کل کے معروف ''ازموں'' کے مقلد بن گئے ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کے سامنے صرف اسلامیوں کی دنیا ہے جس میں غیر مسلم اور مسلمان سرمایہ دار آن فلاکت زدہ مسلمانوں کو براہِ راست اور بالواسطہ لوٹ کر اپنے بنک اور محلات تعمیر کر رہا ہے ۔ اقبال کا دل ان مظلوموں کے لیے آٹھ آٹھ آنسو بہاتا ہے اور وہ بے اختیار پکار اٹھتا ہے :

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

اور وہ مظلوم انسانوں کے سامنے ''جوشِ کردار'' کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے جرأتِ رندانہ کی تبلیغ کرتے ہیں :

راز ہے راز ہے تقدیرِ جہانِ تگ و تاز
جوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز
جوشِ کردار سے شمشیرِ سکندر کا طلوع
کوہ الوند ہوا جس کی حرارت سے گداز

جوشِ کردار سے تیمور کا سیلِ ہمہ گیر
سیل کے سامنے کیا شے ہے نشیب اور فراز

معاشرے کے یہ چند اہم مسائل تھے جن کو اقبال نے بالتفصیل موضوعِ سخن بنایا ہے لیکن آزادیٔ افکار، سنیما، مغربی تہذیب، کورذوق، فرنگی مدنیت اور مسلمان کی کاہلی اور بے عملی پر بھی اقبال کے کلام میں جا بجا اشارے ملتے ہیں۔

:O: